آجکل

شاکھ شک سمت ۱۸۸۶
مئی ۱۹۶۴ء

۶۰ نئے پیسے

نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین جزائر انڈمان و نکوبار کے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔
تصویر میں ویمبر لی گنج کی خواتین نائب صدر موصوف کا خیر مقدم کر رہی ہیں۔

ترتیب

سرورق :- بھوٹیوں کی ایک بستی ، دارجلنگ

(عمل - شری بی - ان جبا)

رسالے کی پشت پر :- نیفا کی ایک لڑکی

جلد ۲۳ نمبر ۱۰

ویشاکھ شک سمت ۱۸۸۶

مئی ۱۹۶۴ء

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل دہلی

سالانہ چندہ :-
- ہندوستان میں :- سات روپے
- پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
- غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ :-
- ہندوستان میں :- ۶۰ نئے پیسے
- پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
- غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو ، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن ، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ملاحظات

جس ملک میں اقلیتوں کی پوری حفاظت نہیں ہوتی اس ملک کی سیاست کو غیر صحت مند اور وہاں کے رہنماؤں کو غیر دانشمند کہنا پڑے گا۔ حال ہی میں پاکستان کے مشرقی حصے مشرقی بنگال میں ہندوؤں اور عیسائیوں پر جو مظالم ہوئے ہیں وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ کئی لاکھ لوگ اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر سرحد پار کر کے ہندوستان میں پہونچ گئے ہیں اور اگر یہی رفتار جاری رہی تو نہ جانے یہ تعداد کتنے لاکھ تک پہونچے گی۔ اس قسم کے فتنے جب اُٹھتے ہیں اپنے اثرات چاروں طرف بکھیرتے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ ہندوستان میں امن کو قائم رکھنے کے لیے پوری جد و جہد کی گئی ہے اور آج یہ بات بے کم و کاست کہی جا سکتی ہے کہ یہاں کی اقلیتوں کو تحفظ کا پورا اطمینان حاصل ہے۔

اصل میں حکومت پاکستان اس لیے نفرت کی آگ کو فرو کرنے میں پہلوتہی کرتی رہی ہے کہ خود اس کے عوام اپنے سیاسی حقوق کا مطالبہ نہ کریں۔ یہ قول ہمارا نہیں بلکہ مشرقی بنگال کے عوامی لیگ کے رہنماؤں کا ہے۔

شعبۂ اردو دلّی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۹-۱۰ اور ۱۳ جنوری ۱۹۶۴ء کو 'مستشرقین کی اردو خدمات' کے عنوان سے ایک اردو مذاکرہ منعقد ہوا۔ اس مذاکرے کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند کرنے والے تھے لیکن اپنی اچانک علالت کی وجہ سے تشریف نہیں لا سکے اور دلّی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ صاحب نے افتتاح کیا، اور اپنی افتتاحی تقریر میں کہا — "اردو جو کم از کم ہندوستان کے پچاس ملین افراد کی زبان ہے، ہندستانی زبانوں میں اس اعتبار سے بڑی ہے کہ اس کا اپنا ایک متین اور مقررہ اسلوب ہے، جبکہ دوسری زبانیں مختلف بولیوں میں بٹی ہوئی ہیں۔" اس کے بعد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ان مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے زحمت گوارا کی اور اس مذاکرے میں شرکت کی۔

پہلا اجلاس :- ۹- جنوری ۱۹۶۴ء بصدارت ڈاکٹر سی۔ ڈی دیش مکھ

عنوان	مقررین
ڈاکٹر اشپرنگر کی خدمات	پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
	ڈاکٹر ول فریڈ نولی (جرمن)
	ڈاکٹر کرومر

دوسرا اجلاس - ۱۰ جنوری بصدارت پروفیسر زین فلیوزا

عنوان	مقررین
گارساں دتاسی کی خدمات	پروفیسر زین فلیوزا (فرانس)
	ڈاکٹر محمد حسن
ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی خدمات	جناب صدیق الرحمن قدوائی
	پروفیسر سیون ڈگبی (کیمبرج)

تیسرا اجلاس - ۱۳ جنوری - بصدارت ڈاکٹر بی۔ این گنگولی

عنوان	مقررین
روسی مستشرقین کی خدمات	پروفیسر برے گنسگی (سوویت روس)
	ڈاکٹر اے ایس سکھاچو (سوویت روس)

اس مذاکرے کے سلسلے میں 'کتابوں کی نمائش' کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جس میں جملہ مستشرقین کی کتابیں فراہم کر کے نمائش کے لیے رکھی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ شعبۂ اردو کے اساتذہ کی جملہ کتب بھی تھیں۔

ظ۔ انصاری

بیلے کا تعارف

انسانی بدن نے آج تک آرٹ کے جتنے روپ نکھارے ہیں، بیلے ان میں سب سے نازک، سب سے پیچیدہ اور گہرا آرٹ ہے۔ سترھویں صدی کے آخر تک یورپ کی موسیقی، مصوّری، رقّاصی اور شاعرانہ ڈرامے نے جس قدر پھول کھلائے تھے، ان کا بہترین گلدستہ 'بیلے' کے نام سے تہذیبِ جدید نے تیار کیا۔ بیلے نہ محض ڈراما ہے، نہ صرف ڈانس اور نہ صرف موسیقی۔ بلکہ ان سب کے متناسب مجموعے کو شاعرانہ تصوّر کے ساتھ پیش کرنا۔ بیلے میں لفظوں کا استعمال نہیں ہوتا، لیکن کسی افسانوی حقیقت کو، کسی خیال کو، حیات اور کائنات کے کسی رمز کو جب اس بے لفظ ڈانس ڈرامے میں پیش کیا جاتا ہے تو جہاں انسانی بدن کی بیانیہ صلاحیتوں کا اور رقص و موسیقی کی ہم زبانی کا احساس ہم کو ہوتا ہے؛ وہیں یہ گمان بھی گزرتا ہے کہ آدمی نے زبان میں چاہے کتنی وسعتیں پیدا کرلی ہوں، لیکن وہ ہے اب بھی کم مایہ، اچھا ہوا جو لفظوں نے فکر و تصوّر کی ان گہرائیوں کو نہیں چھوا، ورنہ خیال کا آنچل میلا ہو جاتا۔*

بیلے کی تعریف ان لفظوں میں کی جاتی ہے: یہ تھیٹریکل آرٹ کی ایک قسم ہے جس میں کوریوگرافی، موسیقی اور ڈرامائی ترتیب کو مدِّنظر رکھا جاتا ہے۔ ڈانسروں کے قدموں اور موسیقی کے تال میل کے ساتھ، آنکھوں اور ہاتھوں کے اشاروں، بدن کے لوچ اور صلابت کے ساتھ کسی خیال کو ایک مناسب طور سے سجے سجائے پس منظر پہ پیش کیا جاتا ہے۔

لیکن یہ تعریف اس اعتبار سے ناقص ہے کہ ہندستانی کلاسیکی رقصوں میں بھی قریب قریب تمام یہی خصوصیات برتی جاتی ہیں، پھر بھی ہم انھیں بیلے نہیں کہتے۔ ناٹیہ شاستر کے مصنّف بھرت منی نے بھی نرت (رقصِ محض) بھوٗ (جذبہ) ابھی نائے (بے لفظ اظہارِ خیال) اور رس (کیفیت) کو رقص کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ ہندوستان کے جو چار کلاسیکی ناچ ہیں، ان کے بیان میں 'ابھی نائے درپن' کے اس اشلوک کا ذکر آتا ہے، جس کا مفہوم یوں ہوگا:

'گیت زبان سے ادا ہوتا ہے، معنی ہاتھوں سے ظاہر ہوتے ہیں، آنکھیں جذبے کا اظہار کرتی ہیں اور قدم موسیقی کی تال پر حرکت کرتے ہیں......'

چند موضوعات پر زمانہ گزرتے گزرتے جو تجربے ہوئے ہیں انھوں نے بہت خاموشی کے ساتھ لفظوں یا گیتوں کو درمیان سے اُٹھا دیا ہے۔ کتھا کلی میں جو کتھا یا بیان ہوتا ہے، اسے حاضرین پہلے سے جانتے ہیں، اداکاروں کے لباس (کاسٹیوم) اور اسٹیج کی سجاوٹ میں بھی ان کرداروں کا اور واقعات کے ماحول کا اسی طرح لحاظ رکھا جاتا ہے جیسے موجودہ بیلے میں، مگر اس کے باوجود انھیں بیلے نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے کلاسیکی ناچ تفصیلات میں کتنے ہی شاعرانہ اور مکمل سہی، مگر ان کو موڈرن بیلے سے وہی نسبت ہے جو پرانی داستانوں کو آج کے ناول سے۔

---

* افسوس کہ ترشّح ہو گیا شہدِ خیال
الفاظ کی بوتلوں میں آتے آتے (جوش)

بیلے سے ہمارے حواس کو جو لذت میسر آتی ہے ۔ اس کی نہایت لطیف کیفیت کو پہنچنے کے لیے آنکھوں اور کانوں کو تربیت یافتہ ہونا کافی نہیں بلکہ قوتِ تخیل بھی چاہیئے وہی قوت تخیل جو اعلا درجے کی شاعری کا سرمایہ ہے ۔ بیلے کے فن پر آرٹ اور ڈرامے کے تنقید نگار ناچ اور موسیقی کے پرکھنے والے کو بولنے کا برابر حق حاصل ہے ۔ اور ان سے زیادہ کوریوگرافی کی باریکیوں کا شعور ہے جو آج کے بیلے پر حاوی ہے ۔ تال سم، خیال و تصور اور بدن کے حرکت و سکون کا نازک اور پیچیدہ رشتہ وہ اصل حقیقت ہے جو کسی بیلے کو کامیاب یا ناکام کرتا ہے ۔

بیلے کے اجزاء

رقص | جب ہم بیلے کے لیے رقصیہ ڈرامے کا لفظ انتخاب کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ رقص اس کا سب سے اہم جزو ہے ۔ یہ رقص کلاسیکی بھی ہوتا ہے کرداری بھی ۔ کلاسیکی رقص میں جسم کی ایک ایک حرکت اور پوز یا ٹھاٹھ کو قدیم آرٹ کے نمونوں سے لیا گیا ہے ۔ ہاتھوں کی حرکات (ہستھ یا مُدرا)، بدن کا کسی ایک انداز میں سنبھالنا، قدموں کا آڑا ترچھا پڑنا ۔ آنکھوں، ہونٹوں اور بازوؤں کے اشارے سے بات کہنا ۔ کسی ایک رقاص کے مقرر کیے ہوئے اصول نہیں ہیں، بلکہ مختلف زمانوں کے فن کار قبیلوں یا فن کار استادوں کے اضافے ہیں ۔ "قبیلوں" کا لفظ یہاں اس رعایت سے لکھا گیا کہ درباروں میں کورنش، آداب، جشن کی تقریبوں وغیرہ کی فنی نمائش کرنے والے بھی ہر زمانے میں مقررہ گھرانوں سے ہوا کرتے تھے (یہ جو آج کل موسیقار استادوں کے گھرانے کہلاتے ہیں، یہ بھی دراصل انھیں قبیلوں یا کنبوں کی محدود شکلیں ہیں) اور کرداری رقص میں تو قبیلوں کے ناچ کی بہت بڑی دین ہے ۔ وسطی یورپ میں خانہ بدوشوں کے ناچ، اسپین میں مُور عربوں کے ناچ، روسیوں کے یہاں قزاقوں اور بنجاروں (lh 612 aH 61) کے ناچ یہ سب قبیلوں کے جوش و خروش، آزاد زندگی، بے تحاشا جولانی اور تیز گہرے رنگوں کا اضافہ کرتے ہیں ۔ عوامی زندگی کا پورا پورا پیش کرنے کے لیے بھی بعض اوقات اس طرح کے کلاسیکی ناچ بیلے میں شامل کر لیے جاتے ہیں ۔

ہمارے یہاں کے کلاسیکی رقصوں کی ممتاز نرتکی یا رُکمنی دیوی ارونڈیل نے اس فن کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا تھا ۔ اب مجھے ان کے الفاظ تو یاد نہیں رہے لیکن خلاصہ یہ تھا کہ ناٹیہ شاستر میں "ناٹیہ دھرمی" اور "لوک دھرمی" کے درمیان جو حد کھینچی گئی ہے، وہ بھی اسی بنا پر کہ 'لوک دھرمی' ناچ میں نارمل زندگی کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور ناٹیہ دھرمی میں وہ پیش کیا جاتا ہے جسے آرٹ اور آرٹسٹ نے مانجھا ہو، انتخاب کیا ہو یا علامتوں کے طور پر استعمال کیا ہو ۔

ڈانس چاہے کلاسیکی ہو یا عوامی، خاص حالات میں ایک کردار یا بہت سے کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو حسن اور تاثیر کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے ۔ بدن کا لوچ، ایک پاؤں کے انگوٹھے پر چکر کاٹنے (جسے کتھک میں گھمیری کہتے ہیں) کی وہ حالت جسے بیلے کی اصطلاح میں Fouette کہا جاتا ہے ٹانگیں اچھال کر اڑان دکھانا، سست قدموں سے کھوئے کھوئے انداز میں سامنے سے گزرنا، موسیقی کی تال پر پاؤں سے زمین چھونا یا بوٹی بوٹی پھڑکانا یہ سب ظاہرا کرشمے ہیں، ان کے پس پردہ رقاصی کا جادو یہ ہے کہ خوش ذوق تماشائی کو انسانی جذبات اور کیفیات کی ان گہرائیوں میں اُتار دیا جائے "جہاں باطن کا سراغ ملتا ہے" * جزئیات ایک کل میں گم ہو جاتے ہیں، الگ الگ واقعات ایک عام منظر نظر نظر آتے ہیں، خودی اور بےخودی کے درمیان فصل نہیں رہتا ۔ فن کار اور تماشائی ایک ہی رس کے متوالے ہوتے ہیں ۔ بعضوں کے نزدیک آٹھ اور بعض کے نزدیک رس نو ہیں ۔ نو رس سے مراد ہیں:[44]

---

* چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے (یگانہ)

۴۴ ۔ بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نے ہندستانی موسیقی کے ۱۷ راگوں راگنیوں پر دکنی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی ۔ "کتاب نورس" ۔ اس کے دیباچے میں ظہوری ترشیزی کیا مزے کی بات لکھتا ہے ! ......
"ہندیاں نُہ شیرہ مجتمع را نورس می گویند و فارسیاں اگر نورس نہالِ فضل و کمالش دانند بجاست و باین معنی کہ این شاہد بے عیب از پردۂ غیب بجلوہ گاہ ظہور نو رسیدہ، نورس خوانند، ہم رواست ......"

شرنگار رس (حسن و عشق) ہاسیہ رس (طنز و مزاح) کرونا رس (درد و غم) ویر رس (شجاعت و جاں بازی) رودر رس (غیظ و غضب) بھینکر رس (خوف و دہشت) وبھتس (یاس و نامرادی) ادبھت رس (حیرت و استعجاب) اور شانت رس (امن و سکون)

اسی لیے کہا گیا ہے کہ ڈانس کوئی فنی شعبدہ گری نہیں ہے بلکہ ڈانسر کی شخصیت کا بھرپور اظہار ہے، کچھ تو یہ کہ ڈانسر کو اس کردار کے موڈ پیش کرنے ہوتے ہیں جن سے ڈرامے کا تعلق ہے، اور کچھ یہ کہ خود ڈانسر یا "بیلے رینا" (ڈانس ڈرامے کی ہیروئن) کی اپنی شخصیت اس میں تازگی، گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

یاد نہیں آتا، کسی انٹرویو میں یا کسی مضمون میں پچھلی صدی کی قیامت خیز بیلے رینا اناپاولووا نے کہا تھا:

'بیلے کی ناچنے والی پیروں سے نہیں، سر سے ناچتی ہے'۔

یہاں عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا' ہر ایک کا منشا موسیقی کے زیر و بم کی مدد سے وجودِ انسانی کی اُن لذّتوں اور اذیتوں میں تماشائی کو شریک کرنا ہوتا ہے جس سے وہ کردار خود گزر رہا ہے۔ یہاں آرٹ کی تمام ترقی یافتہ صورتوں کی روح سمٹ آتی ہے۔ عجب نہیں کہ اسی خیال سے فن کے بہترین نقادوں نے بیلے رینا کے لیے پینٹنگ اور بُت تراشی کا اچھا خاصا علم ضروری قرار دیا ہو۔

بیلے ڈانسر کو صرف انسانوں کے فکر و تصور اور واقعات کی نہیں، بلکہ نادیدہ قوتوں تک کی ترجمانی کرنی پڑتی ہے۔ کہیں ناتراشیدہ پتھر بننا پڑتا ہے (پتھر کا پھول) کہیں سنگ تراش (پگ میلیون) کہیں گھوڑے کے موڈ دکھانے ہوتے ہیں (کبڑا گھوڑا — از پرشوف) کہیں شہسواروں کے آسن (تانبے کا شہسوار — از پوشکن)، کہیں ہنس کی موت مرنا پڑتا ہے (مرتا ہوا ہنس) اور ہر ایک میں اعصاب کا عمل جدا جدا ہے۔ اسی لیے بیلے رینا کو چہرے اور ہاتھوں کی قوتِ اظہار کے علاوہ جو شے سب سے زیادہ لازمی ہے وہ ہے اس کے بدن کی صلابت اور نزاکت۔ بظاہر یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں لیکن علی اکبر خان یا روی شنکر بتا سکتے ہیں کہ بہترین سرود اور ستار میں کلاکار کو یہی دو خصوصیات درکار ہوتی ہیں

اور بیلے میں بیلے رینا یا بیلے دی نوبل (ہیرو) کا بدن ہی تو وہ ساز ہے جس پر موسیقی کے سُر نکلتے ہیں۔ ان تاروں کی جھنجھناہٹ ایسی ہوتی ہے گویا قدم سوچ میں ہیں۔ روح موسیقی کے لیے گوش بر آواز ہے، اور گردن رقص کر رہی ہے، ایک حسین، دل ربا، مثالی پیکر ہمیں موسیقی کی ترجمانی کے بہانے اپنے ساتھ کہیں بہائے لیے جاتا ہے۔

سانچے میں ڈھلا ہوا بدن جب ایک پاؤں کے انگوٹھے پر یا پنجے پر خود کو سادھ کر اپنے ہم رقص کے ہاتھوں کا سہارا لیے ہوئے آہستہ آہستہ گردش کرتا ہے تو اس وقت جسم کا تقریباً ایک ایک عضو نظر فروز ہوتا ہے، لیکن یہ بھی زبردست آزمائش کا ایک ایسا موقع ہے جب آرٹسٹ کی نیت عریانی اور عریانی میں زبردست فرق پیدا کر سکتی ہے۔ نٹ بھی کسی رسی پر جسم کو اسی طرح سادھتا ہے اور بیلے رینا بھی ۲۰ سے ۳۰ فٹ لمبے اسٹیج کے کسی ایک نقطے پر اپنے سارے وجود کو لیے دیے رہتی ہے، ہاتھوں کو، گردن کو اور ایک ٹانگ کو مختلف سمتوں میں بلند کیے ہوئے کئی دائرے بناتی ہے، لیکن یہاں عریانی، ہیجان انگیز نہیں ہوتی بلکہ سدھی ہوئی نگاہ کے لیے حسین منظر کا ایک روحانی کیف بن جاتی ہے، یہ سادھنا کوئی شعبدہ گری نہیں ہوتی بلکہ کسی خیال کی پُرسکون کیفیت کا لطیف اظہار بن جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں رقاصہ آرٹ کے آئینے میں اپنے جسمانی حسن کا نظارہ نہیں کراتی بلکہ اپنے جسم کے ایک ایک نشیب و فراز اور خم و چم کے آئینے میں آرٹ کا جلوہ دکھاتی ہے۔

یہ آرٹ کی ٹریجڈی اور آرٹسٹ کی بدنصیبی ہے کہ فن کے آئینے میں آدمی خود بینی کا شکار ہو جائے۔

بیلے کے فن میں اس بلند مرتبے کو پہنچنے کے لیے عام طور سے سالہا سال کی مشق درکار ہے جو ۸ ، ۹ برس کی عمر سے شروع کی جاتی ہے۔ ڈانس کی تربیت کے ابتدائی مرحلے میں ہی آرٹسٹ کی شخصیت بے نقاب ہونے لگتی ہے اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کس قسم کے کردار ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ ہر ایک ڈانسر کو کلاسیکی ناچ کے اصول سیکھنے ہوتے ہیں، کیوں کہ تختی کی مشق کیے بغیر خطِ شکست نہیں سیکھا جا سکتا۔ نرت میں بھاؤ اور ابھی نائے کی پہچان ہوتی ہے۔ اگر فن کار کی شخصیت

میں تجسس اور گہرائیاں دریافت ہوں تو اس کے معنی ہیں کہ وہ کئی بیلے
کے امتحانوں سے گزر سکے گا اور کئی کئی کرداروں کی روح پیش کر سکے
گا۔ روس کے شروع کے تھیٹر میں اور اٹھارویں صدی کے آغاز
تک دادر مہاراشٹر کے اسٹیج پر بال گندھروی عورتوں کا پارٹ کرتے
رہے جس طرح ہمارے یہاں نوٹنکی میں ہوتا رہا) عموماً مرد آرٹسٹ
ہی عورتوں کا بھی پارٹ کرتے تھے اور انیسویں صدی کے وسط میں
جب رقاصاؤں کی آمد نے یورپ کے بیلے سے مردوں کی اہمیت
کم کر دی تو فرانس، اٹلی، آسٹریا اور روس نے دنیا کو ایسی زبردست
ایسی پہلو دار شخصیتیں عطا کیں جن کے ناموں سے بیلے کے مختلف دور
عین اسی طرح پہچانے جاتے ہیں جیسے بادشاہوں اور فاتحوں کے
نام سے سیاسی تاریخ کے دور۔

موسیقی

فنونِ لطیفہ کا جو تجزیہ مارکسی نقادوں نے سماجی تاریخ کی روشنی
میں کیا ہے، چوں کہ اب تک کسی علمی گوشے سے اس کا رد نہیں ہوا،
اس لیے اسی کو آخری سمجھنا چاہیئے۔ اور اس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے
کہ رقص اور موسیقی کے فن اس وقت بھی ساتھ ساتھ موجود تھے
جب تہذیب نے گھٹنوں چلنا نہیں سیکھا تھا، زبان بھی عالمِ وجود
میں نہیں آئی تھی۔

بیلے میں رقص اور موسیقی کا یہ باہمی تعلق اور بھی گہرا ہو جاتا
ہے۔ موسیقی اپنے سرگم کی رازدارانہ زبان میں رقاص یا رقاصہ سے باتیں
کرتی ہے اور پھر فن کار کے بدن کی ایک ایک جنبش اور لرزش
سے اہلِ ذوق تماشائیوں کے دل و دماغ میں اتار دیتی ہے۔ بیلے کی
موسیقی اور تماشائی کے درمیان حسین، سڈول اور سجل بدن عامل بھی
ہے اور معمول بھی۔ موسیقی کے تاثر میں محو ہو کر اوروں کو محو کر دینا یہ
ہے بیلے ڈانسر کا موسیقی سے رشتہ۔ فن کار کی یہ محویت ہے جو فن میں
دیرپا تاثیر پیدا کرتی ہے اور یہ کچھ بیلے پر موقوف نہیں۔ ہر ایک اعلا
فن کی سرشت یہی ہے۔ *

بیلے چوں کہ ڈانس کی جلوہ گری کا ایک بہانہ نہیں ہے۔ بلکہ
موسیقی کے زیر و بم میں جو خیال، ڈرامائی تسلسل یا فکر کا عنصر پیش کیا جا
رہا ہے، اسے انسانی قالب میں جذب کر لینے اور جذب کر دینے کا ایک
ذریعہ ہے۔ اس لیے قدرتی بات یہ ہے کہ بیلے ڈانسر پر بھی کم و بیش اسی
درجہ محویت طاری ہوتی ہے مشہور برطانوی رقاصہ کلارا ویبسٹر ایک
بیلے میں ڈانس کرتے کرتے شعلے کی لپیٹ میں آگئی اور جل کر ختم ہو گئی۔

روس کی گالینا اولانووا، جو ہماری صدی کی سب سے زبردست
بیلے رینا ہے، موسیقی سے تاثر قبول کرنے کو بیلے ڈانسر کے لیے شرطِ اول
قرار دیتی ہے اور موسیقی کے گہرے تاثر کے متعلق ایک جگہ اپنے سوانح نگار
سے کہتی ہے: **

"..... یہ قطعی ضروری تھا کہ چائکوف کی بے مثال موسیقی کو
غور سے سنا جائے، اسٹیج پر رہ کر خوابوں کی دنیا میں گم ہونا سیکھا
جائے اور خواب کے عالم میں سانس لیا جائے۔....."

بیلے کی موسیقی ڈرامے کے تقاضوں کے مطابق چُنی جاتی ہے
نغمہ نگار استاد جو موسیقی مختلف ناچوں کے لیے ترتیب دے گئے ہیں
اسی میں کتر بیونت کر کے بھی بیلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سمفونی کی

---

* میرے لڑکپن کے دن تھے جب میں نے سبعۂ معلقہ (عربی کے وہ
سات قصیدے جو اسلام سے پہلے کی ادبی اور سماجی تاریخ کے جواہر ریزے
ہیں) پڑھے تھے اور آج تک اس واقعے کا تاثر ذہن میں دھندلا نہیں
ہوا ہے کہ عمرو بن کلثوم نے بھرے دربار میں کھڑے ہو کر جب وہ فی البدیہہ
قصیدہ شروع کیا جس کا مشہور شعر ہے ؎

صبنتِ الکاس عنّا اُمّ عمرٍو — وکان الکاس مجراھا الیمینا

جس میں سے تلوار کی جھنکار اور نیزوں کی ٹھنا ٹھن سنائی دیتی ہے (بالآخر
اس کا خاتمہ جنگ پر ہوا) تو شاعر کے غیرت مندانہ جوش و خروش، مخالف
دربار کے تناؤ اور قصیدے کی رجزیہ موسیقی نے مل کر ایسی محویت کا عالم طاری
کر دیا کہ شاعر نے اپنی پشت پر ایک ہاتھ سے کمان کی نوک کا سہارا لے لیا
تھا، وہ نوک اس کے ہاتھ کو چھید گئی اور شاعر کو خبر نہ ہوئی جب تک قصیدہ
تمام نہ ہو گیا اور تلواریں نہ کھنچ گئیں۔

** - گالینا اولانووا - از لووف انوخین - بزبان روسی انگریزی
صفحہ ۲۷

موسیقی بھی بیلے میں کام آتی ہے اور خود بیلے کو اسٹیج کا آرٹ مانتے ہوئے نظموں، افسانوں یا ڈراموں کے ماحول اور کردار کے مطابق نئی موسیقی بھی تیار کی جاتی ہے۔ بلکہ ٹی کی موسیقی جوں کی توں بیلے میں لے لی جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو موسیقی آرکسٹرا کے لیے، یا یوں کہیے کہ آوازوں کی شیرازہ بندی کے لیے لکھی گئی، وہ رقص کے قامت پر موزوں نہیں ہو سکی۔

چائکوفسکی نے ۱۸۷۷ء میں جب (Λedegeltнoe ozepo) "ہنس کی جھیل" بیلے کے لیے موسیقی تیار کی تو عام خیال تھا کہ اس میں سمفنی کی نرم و نازک اور اشاراتی تکنیک اس قدر استعمال ہوئی ہے کہ تھیٹر کے مقصد میں کامیاب نہ ہو گی، چنانچہ وہ شروع میں ناکام ہو گئی۔

بہت سے مشہور بیلے جو ایک ایک صدی سے چل رہے ہیں، ایسے بھی ہیں جن کی موسیقی ساتھ ہی تیار کی گئی تھی، اور جب اس موسیقی کے ریکارڈ بجائے جاتے ہیں تو بیلے کے مناظر تصور میں آتے ہیں۔

بیلے کی موسیقی دراصل ایک رنگ، ایک طرز یا ایک کیفیت کی موسیقی نہیں ہوتی اور اسی لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک ہی نغمہ نگار اوّل سے آخر تک اسے ترتیب دینے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ موسیقی مختلف طرزوں کا مجموعہ بھی ہو سکتی ہے، بلکہ اس کے رنگوں میں تضاد بھی پایا جا سکتا ہے۔ مثلاً وکٹر ہیوگو کے ناول Hunchback of Notre Dame کو "ازمرالدا" کے نام سے بیلے میں تبدیل کیا گیا ہے۔ یہاں خانہ بدوشوں کے ناچوں میں جو موسیقی دی گئی ہے وہ بالکل دوسری دنیا کی چیز ہے اور باقی بیلے میں اور ہی رنگ ہے۔ 'ریمونڈا' کے اپنے بیلے میں کئی طرزوں کی موسیقی ہے۔ اس میں موسیقی کا ایک ٹکڑا اچانک ایسا آتا ہے جس سے ہمارے کان عربوں کی موسیقی سنتے رہنے کی وجہ سے آشنا ہو گئے ہیں۔

درباروں کے یا کسی جشن کے موقع پر جو ناچ ہوتے ہیں، جن میں والز، تانگو، فاکس ٹروٹ، رمبا، سمبا کی بال روم موسیقی استعمال ہوتی ہے، انھیں کے دوش بدوش مشرق کے گرم ملکوں کی گرم مزاج موسیقی بھی آنکلتی ہے۔ عوامی میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کی ایسی

تک کہ گرجا گھر کے بھجن کی موسیقی کے لیے بھی بیلے میں گنجائش ہے، کچھ سال پہلے مجھے امریکہ کے جدید بیلے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں جاز میوزک کو بھی بیلے کا شریک کر لیا گیا تھا جو آج تک کے رواج اور اصول سے ہٹی ہوئی چیز ہے۔

ہمارے مہربان ارمنی دوست بالاسنیان نے جو 'لیلےٰ مجنوں' بیلے کی موسیقی ترتیب دے چکے ہیں اور آج کل 'شکنتلا' ڈرامے کی موسیقی تیار کر رہے ہیں، یہ تجویز کیا ہے کہ بیلے میں ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی کو اسی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے جیسے مغربی سمفنی کو۔

دراصل موسیقی بھی ڈانس کی طرح بیلے کا مقصد نہیں بلکہ ایک کیفیت، ایک ماحول اور ایک خیال کو پوری قوت، حسن اور گہرائی کے ساتھ طاری کر دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور سبھی ذریعے مقصد کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں، ان کے لیے کوئی اٹل اصول مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ بہت حد تک دار و مدار ان ہاتھوں پہ ہے جو مقصد اور ذریعے کے درمیانی خلاء کو پُر کرتے ہیں۔ بیلے میں یہ فرض کوریوگرافی انجام دیتی ہے۔

کوریوگرافی

اجنتا کے غاروں میں، بلکہ اس سے بھی قدیم غاروں اور مندروں میں جو نقاشی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب سے ۲۱، ۲۲ سو سال پہلے کے ہندوستان میں ناچ اور موسیقی کے ساتھ کوریوگرافی کا تصوّر موجود تھا۔ کوریوگرافر کا کام یہ ہے کہ جو موسیقی خاص مقصد کے لیے چنی یا ترتیب دی گئی ہے، رقّاص یا رقّاصہ کی جسمانی حرکات کو اس کے مطابق کرے اور یہ دھیان رکھے کہ رقص و موسیقی کے اس امتزاج میں وہ ماحول، کیفیت یا خیال اُبھر آئے جسے پیش کرنا مقصود ہے اور ڈرامائی ٹمپو قائم رہے۔

کارلے (آندھرا) کے 'چیتیہ' پر جو سامنے کا منظر پیش کیا گیا ہے، جسے کم از کم دو سو سال قبل مسیح کی کارگری بتایا جاتا ہے، ڈانس کے بارہ پینل پیش کرتا ہے اور ان کے کئی پوز ایسے ہیں جو آج کل کے بیلے میں فن کی نمائش کے لیے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً ایک پاؤں کے

انگوٹھے پر پورے بدن کو دوسرا پاؤں لہرا کر چکر دینا۔ بعض اوقات بیلے رینا یا مرد ڈانسر ایک سانس میں اس طرح کے ۱۶ یا ۲۴ یا ۳۲ چکر کاٹتا ہے تو ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھتا ہے کیوں کہ بیلے کے فن کی اور نزاکتوں کے مقابلے میں کاری گری اور مشاقی کا یہ نمونہ معمولی ذوق کے تماشائیوں کو ہاتھ کے ہاتھ لیتا ہے جیسے غزل کی قافیہ بندی یا مترنم ردیف۔

تقریباً یہی عمرا جنلک کے غار نمبر دس کی تصویروں کی ہے۔ یہاں پندرہ کلاکار ہیں جن میں صرف تین نرتکی ہیں اور باقی ساز نواز ہیں۔ یہ ساز خاموش نہیں ہیں، رقص کے تیز اور مدھم قدموں نے ان کا سنگیت جگا دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ یقین بھی کہ رقص و موسیقی کے امتزاج اور ہم آہنگی کے لیے کوریوگرافی کا بنیادی علم ضرور رہا ہوگا۔

بیلے چوں کہ اوّل سے آخر تک رقص اور موسیقی کی ایسی گھلاوٹ کا نام ہے جس میں الگ الگ مناظر، الگ الگ ناچ، جدا جدا راگ مل کر ایک ڈرامائی تسلسل بن جاتے ہیں اس لیے کوریوگرافر، جو بظاہر کہیں نظر نہیں آتا، بیلے کی تکمیل کے لیے سب سے ضروری عنصر ہے۔ اسے موسیقی کی تمام باریکیوں کے علاوہ رقص کی حرکات، رقص کی تاریخ، بدن کے ایک ایک جوڑ بند کی معمولی سے معمولی حرکت کا مزاج، انسان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا علم، مصوری اور بت گری کی تفصیلات، اور عام طور سے فن کے نشو و نما کی تاریخ کا گیان ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اچھا کوریوگرافر نہ محض وہبی ہوتا ہے نہ کسبی یا اکتسابی۔ فن شناسوں میں اس کی مانگ اتنی زیادہ اور تعداد اتنی کم رہی ہے کہ وہ شاذ و نادر ہی کسی ایک بیلے کمپنی یا کسی ایک ملک میں ٹھہراتی ہے۔ پتی پا اور فوکن جن کی کوریوگرافی کو روس میں الیکسا نذر گورسکی کے پیشرو کی حیثیت سے مستند سمجھا جاتا ہے، یورپ کے کسی ایک ملک میں نہیں بیٹھ سکے، البتہ ان کی ہدایت کاری کے طرز بحرِ اوقیانوس کے دونوں کناروں پر یکساں پھیلے ہوئے ہیں۔

بیلے چوں کہ لازمی طور پر تھیٹر کا آرٹ ہے اس لیے اس کی کچھ حد بندیاں بھی ہیں۔ ایک نازک خیال اس میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے اور ایک معمولی سی بات کسی صورت سے ادا نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً Gizelle ژیزل بیلے میں (جو سب سے پہلے فرانس میں سوچا اور پیش کیا گیا تھا) ہیروئن ایک شرمیلی دیہاتی لڑکی ہے جو اپنی پہلی محبت میں وصل و فراق کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ ایک طرف اس کا دل جاتے ہوئے محبوب کو روک لینا چاہتا ہے، سینے سے وہی صدا نکل رہی ہے جو زمین پر تڑپنے والی آتما کی پکار ہے:

مت جا، مت جا، مت جا، جوگی!

پھر یہ بھی اندیشہ ہے کہ کنواریوں کے حق میں اس پکار کی قیمت بہت بڑی ہے اور یوں پورے وجود میں ایک بے رحم رسہ کشی ہو رہی ہے۔ بیلے سے زیادہ اس کی کیفیت کی ترجمانی کسی آرٹ کے بس کی بات نہیں ہے، لیکن اس کے مقابلے میں اگر یہ کہنا ہو کہ اس لڑکی کی ایک رشتہ دار اسے سمجھاتی بجھاتی ہے۔ تو بیلے اس 'رشتہ دار' کے اظہار میں بالکل بے دست و پا ثابت ہوگا۔ کوریوگرافر، کہ وہی اس کھیل کا ڈائرکٹر بھی ہے، یہاں اپنے فن کی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ موسیقی میں ترمیم کرتا ہے، ڈانس کے پوز، قدم، اشارے، وقفے اور آہنگ میں اونچ نیچ کرتا ہے۔ اسٹیج کی پوری سیٹنگ میں ادل بدل چاہتا ہے، بلکہ بعض ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب اصل کہانی کو، خیال کے ان لفظوں اور موڑوں کو جن پر مصنف نے زور دیا ہے، قطعی تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ شیکسپیئر، بالزاک، پوشکن اور گوگول کے جو فن پارے بیلے کے روپ میں ہمارے سامنے آئے ہیں، جب اصل سے ہم ان کا مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوریوگرافی کے تقاضوں نے ان میں بڑی تبدیلیاں کر دی ہیں۔

کوریوگرافی کا دوگونہ فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ نغمہ نگار اور ڈانسر کے درمیان توازن و تناسب پیدا کرے، ایسا بھی ہوا ہے کہ کوریوگرافر خود ڈانسر ہے، کبھی وہ نغمہ نگار ہوتا ہے یا پروڈیوسر، لیکن ہر حالت میں اس کا کام ہے ایک ایک جزو کو اس طرح جوڑنا کہ فن اپنے اصولوں سے خارج یا بے بہرہ بھی نہ ہو، ڈرامائی ہما ہمی کی رفتار یا ٹمپو حسب ضرورت بڑھتی گھٹتی رہے، رقاص یا رقاصہ کی شخصیت اس کردار کو بھرپور طریقے سے کھولتی جائے جسے پیش کیا جا رہا ہے اور یہ سب اجزا مل کر پوری ایک تصویر اور اس کا

ایک ہم آہنگ تاثر پیدا کریں۔

بیلے میں کوریوگرافی کو تقریباً وہی رول انجام دینا ہوتا ہے جو بلینسکی جیسے اعلا درجے کے ادبی تنقید نگار کو، جو اپنے دور میں خلاق ذہنوں کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور تربیت بھی۔ ادبی شہ پاروں کی تنقید اس انداز سے کرتا ہے کہ خود اس کی تحریر بھی ادبی شہ پارہ شمار کی جائے۔

لباس اور آرائش

بیلے کے فن پر پچھلے ڈھائی سو برس کے اندر مختلف ملکوں میں مختلف حالات پیش آئے ہیں کبھی وہ حسین جسم، حسین ساز اور حسین سرو سامان کی نمائش کا ایک بہانہ اور تھکے ہوئے دماغوں کی تین گھنٹے کی تفریح بن کر رہا، کبھی قومی کردار اور قومی ماحول کا ایک پُرجوش اور پرسوز فن کارانہ پروپیگنڈا۔ اور کبھی صرف کلاسیکی اصولِ فن کی تجدید۔ ہر حالت میں اسے اپنے زمانے کی فنی تحریکوں اور تجربوں کی نمائندگی کرنی تھی۔ اور اس نمائندگی کے لیے رقص، موسیقی، کوریوگرافی کے علاوہ اسٹیج کے ساز وسامان، فن کاروں کے لباس اور آرائش کی چیزوں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔

بیلے، خواہ وہ سنجیدہ ہو، (جس میں ٹریجڈی کا موضوع لیا جاتا ہے)، نیم سنجیدہ ہو (مثلاً دیہاتی زندگی کی سادگی اور آزادی پر)، یا محض تفریحی (جن پریوں کی یا کسانوں کی زندگی سے ایسی کہانیاں، جن میں رقص اور موسیقی کو خوب کھُل کھیلنے کا موقع ملے) بہرحال لباس کی رنگا رنگی اور اسٹیج کی آرائش کو اس میں اہمیت حاصل رہتی ہے۔

آج کا بیلے دیکھتے ہوئے یہ سوچ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب بیلے چوغوں اور زمین بوس فراکوں میں، چہروں پر نقاب ڈال کر ڈانس کیا جاتا تھا۔ کاسٹیوم یا لباس کا تعلق کام کی نوعیت پر ہے۔ ہندستانی کسان کی دھوتی، اودھ کے کتھک ڈانسر کا تنگ چوڑی دار پاجامہ، راجپوتانے کا خاص وضع کا لہنگا اور مہاراشٹر کی چُست ساڑھی ان علاقوں کے موسم کا نہیں، بلکہ اس مخلوق کی مصروفیتوں کا پتہ دیتی ہے۔ بیلے میں اونچی ایڑی کے جوتے، جن سے ٹھمکا دیا جا سکے، کلائیوں سے نیچے تک پھنسی ہوئی یا ڈھیلی آستین کی کرتیاں، جن میں پہنچوں اور انگلیوں کی جنبش نمایاں ہو جائے اور شانوں کی تحرک بھی باقی رہے، بیلے کے دستور میں غالباً رومن یونانی کلاسیکی ناچوں کے وقتوں سے داخل تھے۔ بیلے کا جہاں ان پابندیوں میں قید رہنا مشکل تھا، وہاں بدن کے اور حصوں کو نمایاں کرنا امرا اور شرفا کے اس ماحول میں اور زیادہ مشکل تھا۔ اٹھارویں صدی کی فرانسیسی رقاصہ کمارگو نے اس میں پہل کی اور ۱۷۳۰ء میں اس نے اپنے فراک کو ٹخنوں سے ذرا اونچا کر لیا۔ بلکہ یونانیوں کے سے شفاف گھیردار فراک پہنے جس سے بدن کو کچھ اور آزادی ملے، پیرس میں اس واقعے پر لوگوں نے انگلیاں اٹھائیں اور وہ مقبول نہیں ہو سکا۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں فرانسیسی رقاصہ سلے نے یونانی دیومالا کے قصے "پگ میلین" کو پیرس میں پیش کرتے ہوئے اٹھا ہوا اسکرٹ پہنا، لیکن اس کا بھی رواج نہ ہو سکا۔ یہاں برطانیہ کے مشہور نقادِ فن اور انگلینڈ کے بیلے اسکول کے ڈائرکٹر آرنلڈ ہسکل نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب فرنچ اوپیرا کے پوشاک ساز میلو نے تنگ چولی کا خاص فیشن ایجاد کیا اور اس طرح بھاری اسکرٹ اور اعضا کی آزادی میں سمجھوتے کی صورت نکلی تو پاپائے اعظم نے بھی اپنے دائرۂ اختیارات کے تھیئٹروں میں اس کی منظوری دے دی اس شرط کے ساتھ کہ ان کا رنگ نیلا ہوا کرے تاکہ گوشت کا اشتعال انگیز رنگ پیرہن سے باہر نہ جھلکنے پائے۔* چناں چہ انقلاب فرانس کے بعد آزادی اور انقلاب کے ماحول میں آرٹسٹ کو وہ آزادی مل گئی جس کے طلب کرنے کی جرأت اسے نہیں ہو رہی تھی اور فرانسیسی بیلے ماسٹر اور کوریوگرافر نوویرنے، جو فن کا ایک زبردست امام سمجھا جاتا ہے، جہاں موسیقی اور ڈانس میں بہت سی جدتیں کیں وہاں لباس کو بھی ہلکا پھلکا کر دیا۔ نوویر کو بیلے کی رہنمائی کرنے کے لیے ساٹھ سال کا طویل عرصہ ملا اور کہا جا سکتا ہے کہ جدید بیلے پر آج بھی اس کے پیش کیے ہوئے نمونوں کی اور ان اصولوں کی، جو اس نے اپنے مفصل خطوں میں بتائے تھے، چھاپ لگی ہوئی ہے۔

---

* آرنلڈ ہسکل 'بیلے' ص ۱۲۱ تاریخی پس منظر

جارج برنارڈ شا کی ہم عصر شہرۂ آفاق رقاصہ ایساڈورا ڈنکن نے اپنی جدت طبع اور ہمت کے بل پر نغمے کی لہر اور بدن کے بہاؤ کے درمیان سے بہت سی قیدیں اٹھائیں تو آیندہ کے اسٹیج پر جنسی کشش پیدا کرنے والوں کے لیے راستہ کھل گیا۔ اور اب جو لباس ہم دیکھتے ہیں 'کور دے بیلے' یا بیلے کی ٹولی کے دوسرے کردار تو، خیر نائیلون اور کیروان کے شفاف فراکوں میں ہوتے بھی ہیں، لیکن مرکزی رول ادا کرنے والا جوڑا عموماً ایسے لباس میں آتا ہے جسے انجیر کے افسانوی پتے سے زیادہ لباس کے معنی نہیں دئے جاسکتے۔

میں نے ماسکو، ویانا اور برلن کے بعض بیلے میں دیکھا کہ ہندستانی عورتیں ایک خاص پوز کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہیں یا منھ پر رومال رکھ لیتی ہیں اور ان کی نئی تہذیب میں پلے ہوئے بچے موسیقی کے خواب آور کیفیت میں گم ہو کر بس تکتے رہتے ہیں۔

اسٹیج کی آرائش کو، رنگوں اور لائٹوں کو بھی ایک فضا تیار کرنے میں کم و بیش وہی دخل ہے جو ڈانسروں کے لباس کو۔ موجودہ تہذیب قدیم ہندستان کی رنگ شناسی کا احسان تسلیم کرتی ہے۔ دیوداسیوں کے ناچ میں مندر کے اندرونی نقش و نگار اور مورتیوں کا جو پس منظر اسٹیج کا کام دیتا تھا اس میں بھی رنگوں کا بڑا اہتمام تھا۔ دیسی ریاستوں میں راجاؤں اور نوابوں کے رنگ محل بھی اپنے رنگوں، لائٹوں، گلکاریوں اور کہانیوں کی بدولت اسٹیج کی آرائش کے اچھے ذوق کا پتہ دیتے ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اسٹیج کی آرائش اگرچہ ڈانسروں کے بدن اور نغمہ نگار کی ٹیڑھی سیدھی لکیروں سے باہر کی چیز معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا ان دونوں سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ پس منظر کا نقص پوری کیفیت کو تباہ کر سکتا ہے۔ اسٹیج کی آرائش دراصل مصوّر کا کام ہے۔ چناں چہ مصوّری کے فن میں جتنی تحریکیں چلیں اور جتنے طرز ایجاد ہوئے اور ان کے مرکز اٹلی یا فرانس ہی تھے، جو خود بیلے کا گہوارہ رہے ہیں۔ نیچرل ازم، ریئلزم، امپریشن ازم، ایکسپریشن ازم، اربن ازم، کیوبزم، سمبولزم، ایبسٹرکشن ازم، سوررئیلزم، ان سب نے اسٹیج کی بناوٹ اور آرائش پر اپنا اثر چھوڑا۔

ڈانسروں کا لباس اپنے پس منظر سے بے نیاز ہو کر ابھر نہیں سکتا، اس لیے مصوّر کے مو قلم کے چھینٹے، لباس کی تزئین بلکہ تراش خراش تک پر پڑے ہیں۔ اور آج بھی یہ نزاعی سوال ہے کہ سوررئیلزم (ماورائیت) اور ایبسٹرکشن ازم (تجریدیت) نے بیلے پر احسان کیا ہے یا نہیں۔ پکاسو جیسا مصوّر اور ژین کاکٹو جیسا شاعر، مصوّر اور ڈراما نگار، ایک ہی وقت میں دونوں کا تعلق مغربی یورپ کے بیلے سے رہا ہے اس لیے اشتراکی حقیقت پسندی کی حمایت کے جوش میں ان دونوں کے اثرات سے انکار تو بہرحال نہیں کیا جاسکتا۔

روسی کوریوگرافر اور استاد فن دیاغلیف، جس نے وطن سے باہر زیادہ عزت اور داد پائی بیلے میں اسٹیج کی ایک ایک تفصیل پر زور دیتا تھا۔ مصوّری کے آرٹ میں ہر مکتب خیال کے لیے اس نے اسٹیج پر گنجائش پیدا کی اور اسی کا فیضان تھا کہ سیٹ تیار کرنے والے آرٹسٹوں کو جدت طبع دکھانے کے بے مثال موقعے ملے۔

"سنڈریلا" میں جو تمام دنیا کی بیلے کمپنیاں پیش کرتی رہتی ہیں، ایک منظر آتا ہے کہ ہیروئن سنڈریلا، جسے گھر پہنچنے میں دیر ہو گئی، جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہے اور ارد گرد کا تمام منظر کچھ اس درجہ چپ چاپ بدلتا رہتا ہے کہ ہمارا دھیان منظر کی تبدیلی پر اور اس کی تکنیک پر نہیں جاتا، بلکہ سنڈریلا کے اضطراب اور تیز رفتاری سے طے کیے ہوئے فاصلے کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ پھر ایک اور منظر ہے: شہزادہ گم شدہ سنڈریلا کا ایک سینڈل ہاتھ میں لیے دنیا بھر کی خاک چھانتا پھر رہا ہے اور ہر ایک زنانے جوتے سے اس کی شباہت کا فرق دیکھتا جاتا ہے۔ یہاں محض اسٹیج کے منظر کو آہٹ کیے بغیر بڑے حسن کے ساتھ تبدیل کیا گیا ہے۔ موسموں کی تبدیلی، مقامات کی تبدیلی، یہاں تک کہ حالات و خیالات کی تبدیلی تک منظر اور پس منظر کے در و دیوار پر ظاہر ہونے لگتی ہے۔

پنیٹروں اور اسٹیج تیار کرنے والوں کو اپنا فن آگے بڑھانے میں مشینی ایجادوں سے اُسی طرح مدد ملی ہے جس طرح عمارت سازی کو بلڈوزر اور کرین کی ایجاد سے۔ اسٹیج پر بادل گھر کر آنا، بجلی کا کڑاکنا، بگلوں کی ڈار کا قلابیں کرتے اڑنا، ڈرامائی آرٹ کی یہ جدتیں نقل کو اصل کے اتنا قریب لے آئی ہیں کہ بعض ناقدوں کو ان کے استعمال پر اعتراض ہونے لگا ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے' کلکتہ کے ایک ذہین نوجوان اور مشہور پروڈیوسر ڈائرکٹر جب بالشوئی تھیٹر کا بیلے دیکھ کر باہر نکلے تو انھوں نے اس بات پر سخت نکتہ چینی کی کہ اس قدر روپیہ، اس قدر انرجی اور مشینی ساز و سامان بلاوجہ نقل کو اصل بنا دینے پر صرف کیا گیا حالاں کہ تماشائیوں کو معلوم ہے کہ وہ اسٹیج پر بیلے دیکھ رہے ہیں نہ کہ دریا میں گھوم رہے۔ گھومتے ہوئے اسٹیج کی بدولت پردہ گرنے اور پردہ اُٹھنے کے درمیان کے وقفے بھی مختصر ہو گئے ہیں مناظر کی تبدیلی آسان ہو گئی۔ اور آرائش (Decor) کے امکانات بھی بڑھ گئے ہیں۔ ہمارے ملک میں جو بیلے کو رواج نہیں ہو سکا اور سرکاری سرپرستی کے باوجود آگے نہیں بڑھا اس کی بعض اور بنیادی وجہوں کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمیں لباس اور سامان آرائش کی اتنی سہولتیں میسّر نہیں ہیں اور ایسی کوئی ٹیم نہیں جس میں رقاصاؤں، موسیقاروں' کوریوگرافروں اور مصوّروں کی صف اوّل کے لوگ ایک ساتھ ہاتھ بٹا رہے ہوں۔

(باقی آیندہ اشاعت میں)

شہباز صدیقی امروہوی

کھڑی دعوت

مرا اک یار شاطر عرف جس کا میر مدھو تھا
مکاں پر اس کے اسے شہباز میں اک روز مدعو تھا

کیا تھا اک بڑے اونچے ڈنر کا اہتمام اس نے
دیا تھا دوستوں کو اپنے دعوت کا پیام اس نے

وہ دعوت نام دے رکھا تھا جس کو اس نے دعوت کا
کھلا چیلنج تھا احباب کے حق میں عداوت کا

حقیقت جان سکتے ہیں وہی کچھ اس ضیافت کی
جنھوں نے اس میں شرکت سے عیاں اپنی حماقت کی

عجب علّت سے یہ دعوت بروئے کار آئی تھی
مرا احباب پر آفت یہ صرف اک کار لائی تھی

روایت ایک راوی نے یہ کی ہے اس کے بارے میں
سنی تھی اس نے جو انٹی کرپشن کے اداروں میں

کہیں سے کار اک رشوت میں اس کے ہاتھ آئی تھی
اسی کم بخت کی اس روز رسم رونمائی تھی

فقط یہ مدعا تھا اس کا کھانے پر بلانے سے
کہ موٹر دیکھ لیں احباب اس کی اس بہانے سے

بڑی مشکل سے دن گن گن کے جب دعوت کی رات آئی
ہوا میں شادماں ایسا کہ گویا شب برات آئی

نماز شام عجلت سے ادا کی پانچ رکعت میں
ہوا تیار جانے کے لیے بزم ضیافت میں

کیا آغاز تیاری کا آلاتِ حجامت سے
ہوئی حمام میں تکمیل جس کی غسلِ دعوت سے

نہا دھو کر کیا زیبِ بدن خلعت ضیافت کا
منڈاسا سر پہ باندھا پیر پیٹو کی خلافت کا

ہوا گھر سے رواں الجوع کے شبدیز پہ چڑھ کر
کیا مہمیز اس کو سورۂ المائدہ پڑھ کر

دل فاقہ زدہ پر راہ میں فرحت سی طاری تھی
زباں پر مصدر خوردن کی ہر گردان جاری تھی

اسی انداز سے جب آستانِ یار پر پہنچا
ہنسی قسمت کہ لو مجرم ستونِ دار پر پہنچا

ہوا داخل مکاں میں جب تو وہ منظر نظر آیا
کہ اپنے ہوش میں رہنا مجھے دو بھر نظر آیا

پڑی تھی اک بڑی سی میز پائیں باغ کے اندر
رخ رنگیں پہ جو ڈالے ہوئے تھی شرم سے چادر

چنے تھے اس پہ کچھ برتن بھی، کچھ کھلنے کے آلے بھی
گلاس اور جگ بھی تھے ان میں بڑے چھوٹے پیالے بھی

ڈشیں، قابیں، پلیٹیں، خوشنما، خوش رنگ، خوش منظر
وہ ڈونگے جن کی ساخت دیکھ کر مانڈیں بھی ہوں ششدر

چھری کانٹے بھی تھے، چمچے بھی تھے ہر ایک قامت کے
خجل کرتے تھے جو آلات کو فنِ جراحت کے

ضیائے برق سے برتن دکھاتے تھے وہ تابانی
کہ آب و تاب سے ہوتا تھا ان کی آئینہ پانی

کٹاری کی طرح اسپون اور نائیف چمکتے تھے
نکیلے فارک کانٹا بن کے آنکھوں میں کھٹکتے تھے

مرتّب اس پہ تھا ہر ظرف و آلہ نیوفیشن کا
ڈنر کی میز کیا تھی ردم تھا اک آپریشن کا

رکھے تھے برتنوں میں مختلف اقسام کے کھانے
نہ دیکھے تھے جو جنّت میں بھی آدم اور حوّا نے

قیامت تھی مگر بدبخت باورچی کی یہ حکمت
کہ مقدارِ غذا سے تھی فزوں اقسام کی کثرت

عیاں ہر ظرف سے گو میزباں کا ظرف عالی تھا
مگر مظروف کی قلت سے گویا طبل خالی تھا

عجیب اس پر وہاں احباب کی یہ کس مپرسی تھی
کہ ان کے بیٹھنے کے واسطے مونڈھا نہ کرسی تھی

عبث ہی تھا حقیقت میں نشستوں کا کوئی ساماں
کہ تھے خود سرو قد تعظیم میں کھانے کی سب مہماں

کھڑے تھے اس طرح وہ میز کے چاروں طرف مضطر
کہ جیسے گرد مردے کے زن و فرزند نوحہ گر

بجے جب نو تو وقتِ دعوتِ فاقہ شکن آیا
مقامِ امتحانِ جرأتِ کام و دہن آیا

ہوئی گھنٹی اور اس کے ساتھ ہی مجمع سے شور اُٹھا
خروشِ صورِ اسرافیل سے محشر ہوا برپا

کیا کھانے پہ ہر مہمان نے حملہ وہ طوفانی
کبوتر پر گرے جس طرح شاہینِ قہستانی

مسلماں، جین، ہندو، سکھ، یہودی، بودھ، عیسائی
نظر آتے تھے سب اس میز پر ترکانِ یغمائی

مچی وہ لوٹ ٹیبل پر کہ جو کچھ جس کے ہاتھ آیا
اسی کو جان کر مالِ غنیمت اس نے ہتھیایا

کبابِ سوختہ دل کی کسی نے صاف تھالی کی
کسی نے شیرمالِ خستہ جاں کی گوشمالی کی

کوئی مچھلی پہ تھا کھائے ہوئے خار ایک مدت سے
پھنسایا اس کو کانٹے میں عجب شانِ قساوت سے

کسی نے دی پسند دل کو پسندِ خاص کی عزت
کسی نے کی کچومر کی مذاقِ عام سے درگت

کسی نے شاہی ٹکڑوں پر گدایانہ نظر ڈالی
نگاہوں سے ہی ان کی جانِ شیریں قبض کر ڈالی

ہوا ساعی کوئی مرغِ مسلّم کے اڑانے میں
کیا کرتب عیاں اپنا کسی نے دال کھانے میں

کسی نے قاب اس سرعت سے خالی کی متنجن کی
ہوئی شرمندہ جس کو دیکھ کر رفتار انجن کی

کسی نے فارک ہی سے فرنی پر فیر کر ڈالا
کسی نے قورمے کا خاتمہ بالخیر کر ڈالا

کسی کا قلب بریانی کی حدّت سے ہوا بریاں
کسی کی چشم بورانی کی رقت پر ہوئی گریاں

کسی نے منہ میں انڈا رکھ لیا دھوکے میں آ کے
ٹماٹر کھا گیا کوئی سمجھ کر ان کو آلوچے

کسی نے تاؤ میں آکر چپاتی کو چپتیایا
کسی نے شاد ہو کر کھیر کو چمچے سے چمچیایا
کسی نے دال سے خشکے کی خشکی کو کیا زائل
چھری سے مرغِ بسمل کو کسی نے کر دیا گھائل
کسی نے کوفتے کھا کر اتاری کوفت دن بھر کی
کسی کے پاس پہنچی دور سے خوشبو مزعفر کی
کسی نے چاٹ لی چٹنی، مربہ کھا گیا کوئی
پیالی رائتے کی کھیر میں اوندھا گیا کوئی

ہوئی القصہ اس ہڑبونگ میں وہ میزیوں غارت
کہ نظارہ سے جس کے ہوش میرے ہو گئے چمپت

نہ تھا اس باب پر ہی ختم دعوت کا یہ افسانہ
کیا تھا دوسرے اک سین نے بھی مجھ کو دیوانہ
غضب یہ تھا کہ کھاتے میں مقام اپنا بدلتے تھے
بیا پے اہلِ میت کی طرح کاندھا بدلتے تھے
دکھاتے تھے کبھی تہذیبِ نو کا یہ نظارہ بھی
کہ حصہ مار لیتے تھے دوبارہ کیا سہ بارہ بھی
جھپٹ لیتے تھے ہاتھوں سے کسی کے کوئی برتن بھی
الٹ لیتے تھے اپنی قاب میں اوروں کا بھوجن بھی

غرض یہ ہے کہ سب کے سب وہ بڑھ پیٹو نظر آئے
دہانِ خود طعامِ غیر کے فوٹو نظر آئے

مگر اک میں کہ تھا آداب سے ٹیبل کے بیگانہ
نگاہیں ڈالتا تھا ہر طرف مانندِ دیوانہ
نہ سیکھا تھا ہنر میں نے پلیٹوں کی صفائی کا
نہ آتا تھا مجھے کرتب کوئی ڈونگا ربائی کا
مہارت تھی نہ مجھ کو خوانِ یغما کے اڑانے میں
نہ چنگیزی کی خو بو تھی کہیں میرے گھرانے میں
حدِ تہذیب سے باہر قدم میرا نہ آیا تھا
کھڑے ہو کر نہ موتا تھا کبھی میں نے نہ کھایا تھا
کھڑا تھا اس طرح میں درمیاں ان سینہ زوروں کے
علی بابا ہو جیسے بیچ میں چالیس چوروں کے
مری شامت نے گھیرا تھا مجھے اس طرح بوفے میں
کہ جیسے کوفیوں نے حضرتِ مسلم کو کوفے میں
بنی اس دعوتِ صبر آزما میں میری وہ درگت
بجائے آب و ناں کھاتا رہا کھانے کی میں حسرت

ہوا ہر چند کام اس دھینگا مشتی میں تمام اپنا
بقدرِ کام و دنداں بھی مگر نکلا نہ کام اپنا

غرض یہ ہے کہ ہر صورت سے ہو کر ششدر و حیراں
ہوا عازم کہ کندھے جھاڑ کر ہو جاؤں میں پراں
کھڑے تھے اتفاقاً پاس میرے اک بڑے بھائی
مری آشفتہ حالی دیکھ کر ان کو دیا آئی
بڑی عجلت سے وہ بینگن نگل کر حلق سے چھوٹے
ہوئے مجھ سے مخاطب اور کڑک کر اس طرح بولے
ارے مہاراج امرد ہی یہ ٹک ٹک دیکھتا کیا ہے
کدھر ہے؟ سادا جیم آباد والے نے کہا کیا ہے

یہ جا بیجا ہے تو کف میں یہاں کھانا کسی کا ہے
جو بڑھ کر کھد اٹھا لے ہاتھ میں ڈونگا اسی کا ہے

حبیب تنویر

مغربی تھیٹر اور عورت

انیسویں صدی کے آخر میں جب البسن نے "گڑیا گھر" (Doll's House) لکھا، تو اس زمانے میں یورپ کے سماج میں عورت کو مرد کے ساتھ برابری کا مرتبہ نہیں دیا جاتا تھا۔ عورت کی جگہ گھر کے اندر تھی، رسوئی میں، گھریلو کاموں میں، اور مرد دنیا کے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ گھر کے لیے، بیوی بچوں کے لیے پیسے کماتے تھے، اور عورت پر حکومت کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب "گڑیا گھر" کی ہیروئن نورا نے اپنے حکومت کرنے والے، خود غرض اور مکار شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا اور تعلیم اور محنت کے ذریعے سماج میں اپنا صحیح مقام ڈھونڈنے کا پکا ارادہ کر لیا اور شوہر کے منہ پر دروازہ بند کر کے گھر سے باہر نکل گئی، تو اس کے دروازے کی آواز سارے یورپ میں گونج اٹھی، اور عورت کی سماجی پوزیشن کے سلسلے میں یورپ کے تمام دیسوں میں جلوس نکلنے لگے اور جلسے ہونے لگے۔

اس زمانے کے لیے یہ صورت حال نئی تھی، لیکن یورپ کا سماج اس نئی تحریک کا اثر قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔ چند ہی برسوں میں یورپ کے سماج میں اتنا تغیر ہوا کہ عورتیں دفتروں میں کام کرنے لگیں، مشینیں چلانے لگیں اور سماج کے ہر کام میں مرد کے برابر آ گئیں۔

لیکن یہ سماجی تغیر اتنا اطمینان بخش نہ تھا جتنا کہ روس کے انقلاب کے ابتدائی دور میں نظر آتا تھا۔ ظاہراً سماجی تبدیلیوں کے پردے میں مرد ہر طرح کے جنسی استحصال کے نئے طریقے دریافت کرنے میں لگا ہوا تھا، اور بہت جلد کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

یہ زمانہ تھا کہ روس میں گورکی نے 'ماں' لکھ کر لوگوں کو چونکایا۔ انگلستان میں برنارڈ شا نے البسن ہی کے زیر اثر کینڈیڈا Candida لکھا، جس کے ذریعے وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مائیں اور بیویاں ہی دنیا کی عظیم شخصیتوں کو جنم دیتی ہیں، بڑے بڑے سائنس دانوں، ادیبوں اور قومی رہنماؤں کی تخلیق کرتی ہیں۔

چیخوف نے اسی مسئلہ کو دوسرے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کے ڈراموں کی عورتیں دل میں بڑی بڑی امنگیں تو رکھتی ہیں، لیکن مجبور ہیں، عملی قدم نہیں اٹھا سکتیں، اپنے ماحول کا شکار ہو کر، اسی میں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ کوئی ماسکو جانے کی امنگ رکھتی ہے، کوئی کسی کو چاہتی ہے، شادی اور شوہر سے بیزار ہے یا کسی اور سے عشق کرتی ہے، مگر کوئی کچھ کر نہیں سکتا۔ یہی اس کا المیہ ہے، اور "چیری آرچرڈ" "سی گل" "تھری سسٹرس" "انکل وانیا" جیسے ڈراموں کی عورتیں یہی المیہ پیش کرتی ہیں۔

آج کے یورپ اور امریکہ میں عورت کا مرتبہ بہت سی چیزوں میں مرد کے برابر مانا جاتا ہے۔ گھر کے کام کا مسئلہ ختم ہو کر رہ گیا ہے، چناں چہ نوکروں کا طبقہ تو مدتوں پہلے ختم ہو گیا تھا۔ اب بیوی کو بھی گھر میں بہت زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا۔ سارا کام

مشینیں کرتی ہیں۔ کھانے کے لیے جگہ جگہ ریسٹورنٹ کھلے ہیں یا ایسے بازار موجود ہیں جہاں سے کھانا اس طرح تیار مل جاتا ہے کہ ذرا سی گیس کی آنچ دکھایئے اور کھانا پلیٹ پر رکھ کر کھا لیجئے۔ بچا ہوا کھانا برف کی مشین میں دبا دیجئے وہ ہفتوں اچھی حالت میں پڑا رہے گا۔

اس سے عورت کو اتنی فراغت تو نصیب ہوئی کہ وہ سماجی، دفتری اور سیاسی کاموں میں حصہ لے سکے۔ لیکن بچے ابھی مشینوں سے پیدا نہیں ہو رہے ہیں چناں چہ بچوں کی بیڑی ابھی تک عورت کے پاؤں میں بندھی ہے۔

یہی بیڑی عورت کی طاقت بھی ہے اور یہی اس کی کمزوری بھی۔ یعنی بچوں ہی سے عورت کی خوشی اور تکمیل، اور سماج میں اس کا مان ہے۔ اور بچوں ہی کی وجہ سے عورت سماج میں مرد کے برابر آنے سے روک دی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ویسے تو بظاہر مغربی ممالک میں عورت کے لیے کام کرنے کے بہت سے مواقع بھی ہیں، لیکن دراصل عورت کی جگہ سماج میں وہ نہیں ہے، جو ہونی چاہیئے۔ چناں چہ چند برس پہلے براڈوے کا مشہور ڈراما "Born yesterday" نیویارک میں اس لیے بہت زیادہ کامیاب ہوا کہ یہ گویا ایک طرح کا جدید "گڑیا گھر" تھا اس میں ایک کروڑپتی بیوپاری کی ایک رکھیل ہے، جس کے ساتھ وہ کھیلتا رہتا ہے، لیکن اسے کھلونے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتا بلکہ سمجھتا ہے کہ عورتوں کے عقل ہی نہیں ہوتی۔ لیکن آخر میں یہی کم سمجھ لڑکی کچھ ایسے پر پرزے نکالتی ہے کہ وہ بھی دنگ رہ جاتا ہے اور "گڑیا گھر" ہی کی طرح وہ دروازہ زور سے بند کر کے اس کے گھر سے نکل جاتی ہے۔

اس ڈرامے کو کھیلے ہوئے آج دس سال سے زیادہ زمانہ گزر گیا، لیکن عورت کی سماجی پوزیشن آج بھی وہی ہے جو تھی۔ گھر کے باہر کی زندگی میں مرد عورت میں جو تفرقہ نظر آتا ہے، وہی گھر کے اندر بھی نظر آتا ہے یعنی مغربی ممالک کی گھریلو زندگی بھی ایک حد تک تتر بتر نظر آتی ہے۔

بچوں کی وجہ سے عورت کو وہ آزادی حاصل نہیں جو مرد کو باہر کی زندگی میں حاصل ہے۔ اس آزادی کا اکثر مرد غلط فائدہ بھی اٹھاتے ہیں، جس کا اثر گھر کی زندگی پر پڑتا ہے۔ چنانچہ گھر کی زندگی کا سکون ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج نیویارک کا سب سے کامیاب ڈراما جسے چلتے ہوئے ایک برس سے بھی زیادہ ہو گیا۔ ایڈورڈ آلبی کا نیا ڈراما ہے جس کا نام ہے "Who is afraid of virginia wolf?" اس ڈرامے میں میاں بیوی، جن کے کوئی بچہ نہیں ہے، حالانکہ دونوں کو بچے کی تمنا ہے، ایک دوسرے کو دن رات گالیاں دیتے رہتے ہیں، اور ڈرامے سے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسی گالی گلوچ پر ان کی ازدواجی زندگی قائم ہے۔ یعنی اگر یہ بھی نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو۔ محبت نہیں ہے اگر نفرت بھی نہ ہو تو دونوں کے درمیان کوئی تعلق ہی نہ رہ جائے۔

ڈراما ایک طنزیہ ہے، جس میں مرد عورت کے ازدواجی رشتے کے کھوکھلے پن کو اجاگر کیا گیا ہے۔ لیکن ڈرامے کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ یہ صورت حال یونہی رہے گی، اور اسی وجہ سے دیکھنے والوں کا دل اداس ہو جاتا ہے۔

انگلستان میں سترھویں صدی کی لکھی ہوئی ایک ریسٹوریشن کامیڈی (Restoration Comedy) کی حال ہی میں تجدید ہوئی ہے۔ وانبرا (Vanburgh) کی کامیڈی "Provoked Wife" جس کے اندر سترھویں صدی کے حکمران طبقے کے مرد عورتوں کے جنسی تعلقات کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اٹھارویں صدی کا لکھا ہوا جان گے (John Gay) کا مشہور ڈراما "Beggar's Opera" بھی مدتوں بعد یہاں لندن میں پھر سے دکھایا جا رہا ہے۔ یہ بھی ایک طنزیہ ہے اور اس میں نچلے طبقے کی گری ہوئی زندگی اور اس زندگی کا اقتصادی اور جنسی افلاس دکھایا گیا ہے لیکن چھینٹا حکمران طبقے کے دامن ہی پہ پڑتا ہے۔

یہ دونوں ڈرامے آج کے حالات کے چند پہلوؤں پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ مثلاً Beggar's opera کی ایک طوائف کہتی ہے۔ "میں نے کل رات ایک ٹوری (Tory) کے ساتھ

بسرکی۔ بے چارے اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ تو ری بھی اور بہت سیدھے سادے۔"

ان ڈراموں کو دیکھ کر لوگ اس طرح ہنستے ہیں جیسے کسی نے ان کے اپنے ماحول کا مذاق اڑایا ہو۔ اور کیوں نہ ہو آخر Profumo affair کی یاد ابھی لوگوں کے دل میں باقی ہے۔ یہی جنسی افراتفری لندن کے نئے ڈرامے الفی (Alfie) میں بھی پائی جاتی ہے اور یورپ کے اکثر نئے ڈراموں میں بھی۔ وہی افراتفری مغربی ممالک کی زندگی میں بھی صاف نظر آتی ہے۔ عورت کی غلامی کے پیرائے بدل گئے ہیں، لیکن غلامی باقی ہے۔ یعنی مغربی کلچر ایک ایسی منزل پر پہنچتا نظر آتا ہے جہاں کسی بڑے آزر کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے، اور لوگ اس صورت حال کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

بلراج مینرا

بس اسٹاپ

زندگی کے اس موڑ پر، اس لمحے، مجھے انتظار کرنا تھا، بس انتظار کرنا تھا۔

میں اس بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کر رہا تھا۔ میری تپتی ہوئی گھڑی میں ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

نام کو تو وہ بس اسٹاپ تھا — نام کو کیا، وہ واقعی بس اسٹاپ تھا کہ بجلی کے کھمبے پر، تین ہاتھ اوپر، سبز رنگ کے ٹین کے ٹکڑے پر لکھا ہوا تھا Bus stop by request ہاں! اگر آپ بس اسٹاپ پر سر چھپانے کی جگہ بھی چاہیں، تو وہ بس اسٹاپ نہیں تھا، نہ تو وہاں کوئی شیڈ تھا اور نہ ہی کوئی پیڑ۔ راکھ کی رنگت کی ایک لمبی ویران سڑک تھی، بجلی کے تاروں کی پرچھائیاں تھیں۔ باریک اور متوازی اور کھمبے کی پرچھائیں تھی، ٹھگنی سی، زمین میں دھنسی ہوئی کہ سورج سر کے اوپر تھا۔

میں یہ جان نہ پا رہا تھا کہ اس بس اسٹاپ پر میرے قدم کیسے آن پہنچے تھے — شہر سے دور، اجاڑ بس اسٹاپ، جون کی دوپہر، پینے کو پانی نہیں، دم لینے کو سایہ نہیں اور میری کم بختی کہ ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور بس کو ایک بجے آنا تھا۔

میں اس اجلی دوپہر میں اپنے دل کی تسکین کے لیے بھٹک رہا تھا اور بھٹکتے بھٹکتے اس بس اسٹاپ پر آن پہنچا تھا مگر چند لمحوں میں مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ بس کے آنے تک میرا دل ہی نہ رہے گا، وہیں بس اسٹاپ پر پگھل جائے گا۔

میں نے سوچا کہ — کسی اور سواری کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اجاڑ، چلتے پھنکتے بس اسٹاپوں پر رکشا، تانگہ، اسکوٹر یا ٹیکسی کہاں ملتی ہے۔

اب سوائے اس کے کہ بس کا انتظار کرتا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

اب میں تھا، دھوپ تھی، سڑک تھی اور بجلی کا کھمبا تھا۔

اس سے بڑھ کر بھلا بس اسٹاپ اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس انتظار کے لمحوں میں ایک راکھ کی رنگت کی سڑک ہی تھی جو مرکزِ نگاہ ہو سکتی تھی اور تھی۔

کہیں کہیں تار کول پگھل گیا تھا اور سڑک گہری کالی ہو گئی تھی اور سورج کی تیز روشنی میں چمک رہی تھی۔

سڑک کو تاحدِّ نظر ناپ تول لینے کے بعد میں نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ منٹوں کی سوئی پینتیس کے نشان کے قریب تھی — میں نے صرف پانچ منٹوں میں اس چلتے پھنکتے ویرانے کا بھرپور جائزہ لے لیا تھا اور ایک بس تھی کہ میری نظروں سے دور، جانے کہاں تھی اور میں دھوپ میں جلتا بھنتا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

چند لمحے میں گھڑی کی جانب دیکھتا رہا اور ان چند لمحوں میں مجھے محسوس ہوا کہ میری زندگی کا حصار، میرے گوشت پوست کا حصار، میرے ذہن کا حصار جس میں ساتوں سمندروں کی وسعتیں سمٹی ہوئی ہیں، پل بھر میں بکھرنے کو ہے۔

"ہم نسیمت سے تک انتظار بھی نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔

ہماری زندگی کس قدر ناپائدار ہے...... !" میں مسکرا دیا۔ لیکن بس کا انتظار تو میری بے بسی تھی۔

"ہم جھنجھلاہٹ میں اوٹ پٹانگ سوچنے لگتے ہیں...... !"

میں پھر مسکرا دیا۔

بس کا انتظار تو میری زندگی تھی۔

میں نے پھر گھڑی کی جانب دیکھا۔ منٹوں کی سوئی جوں کی توں سست تھی۔

میری زندگی، اس سے پہلے، صرف ایک بار بس اسٹاپ پر ٹھہری تھی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب میری کنپٹیوں پر سفید بال نہیں تھے۔ میری آنکھیں عینک کی محتاج نہیں تھیں اور مجھے جان لیوا انتظار کی لذّت نصیب نہیں ہوئی تھی۔

اور پھر وہ بس اسٹاپ بھی کہیں مختلف تھا — وہاں سر چھپانے کو شیڈ تھا، پیاس بجھانے کو پیاؤ تھا، بھانت بھانت کے لوگ تھے، بھانت بھانت کی آوازیں تھیں۔ لوگ بسوں سے اترتے اور تانگوں پر چڑھ جاتے۔ تانگوں سے اترتے اور بسوں پر چڑھ جاتے — اور اسکوٹر تھے، رکشا اور ٹیکسیاں تھیں — اور ڈھیر سارے، لڑتے جھگڑتے، ہنستے بولتے مسافر تھے۔

میں اس بس اسٹاپ پر بھی بس کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ میں کون سی بس کا انتظار کر رہا تھا اور مجھے کہاں جانا تھا۔ اتنا یاد ہے، اس دن بھی جون کی دوپہر تھی، دھوپ تیز تھی کہ نہیں اس کا مجھے اندازہ نہیں کہ میں شیڈ تلے کھڑا تھا۔ ایک دو مرتبہ میری زبان خشک ہوئی تھی اور میں نے پیاؤ سے کنوئیں کا ٹھنڈا اور شہد سے میٹھا پانی پیا تھا۔ گھڑی دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ ان گنت چہرے تھے نظروں کے سامنے۔ شاید میں چہروں سے اکتا کر گھڑی دیکھتا اور مجھے اپنی بس کے انتظار کا احساس ہوتا مگر یہ بھی نہ ہوا کہ کچھ اور ہو گیا۔ اب یہ میری خوش قسمتی تھی یا اس بس اسٹاپ کا اعجاز، کون جانے ؟

میں یونہی اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا — یونہی ہنستے بولتے مسافروں کو دیکھ کر میری نظریں ایک مزدور کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ مزدور جو اس وقت مرکزِ نگاہ تھا، مجھے یاد ہے، ٹھیلہ کھینچ رہا تھا۔ ٹھیلے کے دونوں بم اس کے گرے ہوئے ہاتھوں میں تھے اور دونوں بموں سے بندھی ہوئی رسی اس کے دائیں کندھے میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ چیونٹی کی چال سے ٹھیلہ کھینچ رہا تھا کہ ٹھیلے پر اس کے قد سے کہیں اونچے تک آگے پیچھے ٹرنک لدے ہوئے تھے۔ ایک رسی تھی جو ٹرنکوں کو روکے ہوئے تھی، ایک میلا کپڑا تھا جو اس کے بائیں کندھے پر رکھا ہوا تھا — دس قدم ٹھیلہ کھینچنے پر وہ رک جاتا۔ بائیں ہاتھ کا بم چھوڑ دیتا، بوجھ اس کے دائیں کندھے اور دائیں بازو پر آن پڑتا۔ وہ تھکا تھکا سا بایاں ہاتھ اُٹھا کر بائیں کندھے پر رکھا ہوا میلا کپڑا اُٹھاتا، چہرے اور گردن پر پھیلا ہوا پسینہ پونچھتا، کپڑا پھر کندھے پر جماتا اور بایاں بم تھام کر پھر ٹھیلہ کھینچنے لگتا، پھر دس قدم پر رکتا، پھر پسینہ پونچھتا اور پھر چیونٹی کی چال سے چل پڑتا۔

اتنا مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں نے یہ سوچا تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے ؟

اس کا ہر دسواں قدم ایک پڑاؤ تھا۔ یہ میں نے جان لیا تھا اور پھر میں نے اس کی منزل بھی دیکھی۔

میری نظروں کے سامنے وہ چوتھے پڑاؤ پر رکا ہی تھا اور اس نے ٹھیلے کا بایاں بم چھوڑا ہی تھا اور بائیں کندھے پر رکھا ہوا میلا کپڑا اُٹھانے ہی کو تھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ گئیں، رسی ڈھیلی پڑ گئی اور ٹرنک اوپر تلے نیچے آن پڑے۔ ایک ٹرنک اس کے سر پر آن پڑا اور ٹرنک کی نوک اس کی دائیں کنپٹی میں اتر گئی۔

اس کے بعد یہی ہوا کہ بسیں رک گئیں، اسکوٹر، تانگے، رکشا، ٹیکسیاں سب رک گئے۔ شیڈ خالی ہو گیا، لوگ بھاگ اُٹھے اور پھر چند لمحوں کے بعد بسیں پھر دوڑنے لگیں، اسکوٹر، تانگے، رکشا ٹیکسیاں سب دوڑنے لگے، شیڈ بھر گیا، لوگ لوٹ آئے۔

اور وہ مزدور جو مرکزِ نگاہ تھا، اللہ جانے کہاں تھا۔ اور ان چند لمحوں میں اللہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔

کسی نے کہا تھا، چار بجے ہیں، تو میری توجہ اُدھر ہوئی تھی، میری بس کو نہیں آنا تھا اور نہیں آئی تھی اور میں بنا کسی احساس اور مایوسی کے لوٹ آیا تھا۔

ابھی ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

"ایک بس اسٹاپ دوسرے بس اسٹاپ سے کس قدر مختلف ہے۔۔۔۔!" میں مسکرا دیا۔

میرے لب خشک ہو گئے تھے۔ زبان سوکھ گئی، حلق کانٹا ہو گیا تھا۔

میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں بُری طرح جل رہی تھیں۔

"ایک بس اسٹاپ دوسرے بس اسٹاپ سے کس قدر مختلف ہے۔۔۔۔!" میں پھر مسکرا دیا۔

"ہر بس اسٹاپ کی، ہر نقطے کی اپنا دنیا ہوتی ہے۔۔۔۔!" مسکراہٹ بدستور میرے لبوں پر تھی۔

میں نے پلکیں گرا کر چکا چوند آنکھوں میں اندھیرا لانا چاہا مگر میری آنکھوں میں سورج اتر گئے تھے۔ میں نے پھر پلکیں اٹھائیں۔

سڑک جوں کی توں دراز تھی۔ دُور دُور تک کوئی مزدور نہ تھا، کوئی ٹھیلہ نہ تھا۔

میں اس بس اسٹاپ کا مقدر تھا یا پھر وہ بس اسٹاپ میرا مقدر تھا۔

میں نے کھمبے کی جانب بنا کسی احساس کے دیکھا۔ تین ہاتھ اوپر، سبز رنگ کے ٹین کے اس ٹکڑے کی جانب دیکھا جس پر لکھا تھا Bus stop by request اور پھر مسکرا دیا۔

اور پھر میں نے بجلی کی متوازی تاریں دیکھیں اور پھر اوپر آکاش دیکھا — پھر وہی لاکھ کی رنگت کی سڑک تھی جو کہیں کہیں تارکول کے پگھلنے سے گہری کالی ہو گئی تھی اور چمک رہی تھی۔

ایک بجنے میں دس منٹ تھے۔

مجھے تھکن کا شدید احساس ہو رہا تھا — میں نے کھمبے کا سہارا لے لیا۔

"میں تنہا ہوں۔۔۔۔۔۔ نہیں میں تنہا نہیں ہوں کہ منتظر ہوں۔۔۔۔۔!" میرے سوکھے لب مسکرانے لگے۔

"میں تنہا نہیں ہوں کہ منتظر ہوں۔۔۔۔۔۔۔ دس منٹ ہی تو رہ گئے ہیں بس کے آنے میں، بس کے مجھ تک پہنچنے میں ۔۔۔۔۔۔۔ میرے مجھ تک پہنچنے میں۔۔۔۔۔۔ دس منٹ کیا ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔!" میرے لب جوں کے توں مسکراہٹیں اپنائے ہوئے تھے۔

میں نے دائیں ٹانگ پر جسم کا پورا بوجھ ڈالتے ہوئے بائیں ٹانگ کو تھکن سے نجات دلائی، رومال سے آنکھیں مسلیں۔ پھر مسلیں — عینک کے شیشے رگڑے اور عینک آنکھوں پر چڑھا لیں۔

مجھے تعجب ہوا۔ آخری منٹ درمیان میں کھڑا تھا۔

اور پھر میں نے دیکھا۔ میری تپتی ہوئی گھڑی میں ایک بج رہا تھا۔

بس کا دُور دُور تک کوئی نشان نہ تھا۔

میں تھا، دھوپ تھی، سڑک تھی اور بجلی کا کھمبا تھا اور زندگی کے اس موڑ پر، اس لمحے، مجھے انتظار کرنا تھا۔ بس انتظار کرنا تھا۔

ضروری گزارش

غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کیے جاتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں۔

شارق

اے جنّتِ کشمیر

ہے اوس کی بوندوں میں مئے ناب کی تاثیر
ہے تیری گھٹاؤں میں گل و لالہ کی تقدیر
رقصاں ہے فضاؤں میں عجب کیف کی تنویر
ہے موجِ صبا یا کوئی خوشبوؤں کی زنجیر
اے جنّتِ کشمیر!

ہر وادیٔ رنگیں ہے بہاروں کا حسیں خواب
ہر چشمۂ شفّاف ہے آئینۂ مہتاب
ہر گام پہ کھلتا ہے تجلّی کا نیا باب
ہر ذرّہ تری خاک کا ہے حسن کی تصویر
اے جنّتِ کشمیر!

ہیں کتنی حسیں، کوہ پہ برفاب[1] کی دھاریں
ہیں کتنی دلآویز چناروں کی قطاریں
جس سمت نظر ڈالیے چھائی ہیں بہاریں
ہر گام پہ اک جلوۂ دل کش ہے عناں گیر
اے جنّتِ کشمیر!

ہر پھول کے لب پر ہیں بہاروں کے فسانے
ہر غنچے کے سینے میں ہیں نکہت کے خزانے
باغوں میں ترے عام ہیں مستی کے ترانے
چڑیوں کا ہر اک نغمہ ہے پیغامِ ابد گیر
اے جنّتِ کشمیر!

ہے خسانۂ تسکیں ہے پہلگام کا منظر
جہلم سے ٹپکتا ہے مے و جام کا منظر
کس درجہ حسیں ہے سحر و شام کا منظر
وہ ہنستا ہوا جاتا ہے جو آتا ہے دل گیر
اے جنّتِ کشمیر!

پنہاں ہے تری خاک میں اخلاص کی دولت
تاباں سرِ کہسار ہے تنویرِ اخوّت
ہے عام حدوں میں تری دستورِ محبّت
انساں کی عظمت کا نشاں ہے تری تصویر
اے جنّتِ کشمیر!

[1] گلیشیر

جعفر حسینی جعفر

روح کا مکالمہ خدا کے ساتھ

(سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظم "The soul's prayer" کا آزاد منظوم ترجمہ)

نازِ طفلی کے سہارے میری طبعِ راز جو
جسمِ خاکی میں مرے اے مالکِ ہر خشک و تر
کارفرما ہے یہاں قانونِ قدرت کون سا
جان پر بارِ غمِ ہستی اٹھالانا ہے کیا
دستِ فیضانِ ازل سے اپنے یارب کر عطا
کر عطا یارب بلانوشی کا وہ اعلیٰ مقام
منکشف ہو جائیں جس سے رازہائے کائنات
زندگی اور جذبۂ الفت کے پیچیدہ نکات
التجا دل ہی میں تھی یوں غیب سے آئی ندا
کیا قیامت ہیں جتادے گا یہ تیرا التماس
بادۂ عیش و مسرّت بادۂ نام و نمود
تجھ کو پہنا کر ادب سے بہجت و شہرت کا تاج
آگ الفت کی جلاڈالے گی جب تیرا لہو
تجھ کو پہنچادے گی اس منزل پہ جب جانے گی تو
تو اماں مانگے گی اس دم آرزوئے خام سے
اک بصیرت عرش سے نازل کروں گا بے گماں
وہ بصیرت جو دکھادے گی رہِ امن و اماں
تجھ پہ کھل جائیں گے اس دم رازہائے کائنات
موت کیا ہے مرہمِ زخمِ خرابِ زندگی
عالمِ امکاں کی ہر شے ہے مری آئینہ دار

یوں مخاطب حق سے تھی اے خالقِ ہر رنگ و بو
روح تیری جلوہ فرما نور تیرا جلوہ گر
فلسفہ کیا ہے بھلا آخر حیات و موت کا
اور پھر یہ جاں بحقِ تسلیم فرمانا ہے کیا
اک مسرّت بے نہایت اک الم لا انتہا
ہر مسرّت نذرِ صہبا ہر مصیبت غرقِ جام
رازِ تخلیقِ حیات و رازِ تحلیلِ حیات
قبر کے اسرار لرزاں جس سے روحِ کائنات
طفلکِ ناداں تری مقبول ہوتی ہے دعا
جذبۂ رنج و مسرّت جذبۂ امید و یاس
خواہد ارزاں داشت از بہرِ تو ایں چرخِ کبود
ساکنانِ ارض لائیں گے عقیدت کے خراج
شعلۂ غم سے نکھر جائے گی تیری آرزو
تیری طفلانہ تمنا تیری اندھی آرزو
تا نکل آئے فریبِ نفسِ نافرجام سے
زینۂ اوّل ہیں جس کے بام کے ہفت آسماں
روشنی میں جس کی مل جائیں گے منزل کے نشاں
رازِ تخلیقِ حیات و رازِ تحلیلِ حیات
موت میں تابندہ تر ہے آفتابِ زندگی
زیست بھی آئینہ دار اور موت بھی آئینہ دار

زندگی منشور[1] ہے میرے ہی نورِ ذات کا
موت بھی اک عکس ہے میری تجلیات کا

[1] منشور (مثلث) ایک تین مستطیلی پہلوؤں والا شفاف بلوری جسم ہوتا ہے جس میں سے آفتاب کا سفید نور گزر کر قوسِ قزح کے سات رنگوں میں منتشر ہو جاتا ہے اور پردہ پر سرخ، نارنجی، زرد، سبز، آسمانی، نیلگوں اور بنفشی رنگوں کی ایک نہایت خوب صورت دھاری سی بنا تا ہے جس کو Spectrum یا طیف کہتے ہیں۔ علم طبیعیات میں Prism کا ترجمہ منشور سے کیا گیا ہے۔

فیلڈ مارشل عبد السلام محمد عارف صدر جمہوریہ عراق ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے تھے۔ آپ نے فرمایا
کہ ہندوستان اور عراق کے دوستانہ تعلقات قدیم زمانے سے قائم ہیں اور یہ امید ظاہر کی کہ اب ان تعلقات
میں مزید استحکام پیدا ہوگا۔ اپنے قیام کے دوران میں آپ نے ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کیا
آپ ۲۵ - مارچ ۱۹۶۴ء کو تاج محل دیکھنے کے لئے آگرہ تشریف لے گئے۔ یہ تصویر اس موقع کی ہے۔

ہندوستانی بیلے

کٹھ پتلی ناچ ۔ سہگل گروپ

رام لیلا بیلے ۔ پیش کردہ سچن شنکر

ماروا ڑی کسانوں کے جوڑے کا رقص
کمیشور اور زہرہ سہگل
↓

گوالن

اودے شنکر کے پیش کردہ بیلے 'کرت ارجن' کی اُپسرائیں

راس لیلا بیلے کا ایک منظر
ایک گوپی اور گوپ رقص کر رہے ہیں

اودے شنکر بھیل ناچ
پیش کر رہے ہیں

ناچ
پ

سوان لیک' بیلے کے دو فن کار
ارکن میڈبیلووا اور ثمردن توگلیوف

ڈ اسیٹٹ میوزک ہال کے دو فن کار
با اسکرد دارسووا اورنکولائی سائیرائے

رُوسی بیلے

بالشوئی تھیٹر کی مشہور بیلی رینا
...

نذیر رحمانی

میڈم کاما

سیاست و صحافت، ایثار و قربانی اور حصولِ مقصد کے لیے مسلسل اور ان تھک جد و جہد کے میدان میں جس طرح مردوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر حیاتِ جاوداں حاصل کی ہے اسی طرح خواتین نے بھی نسلِ انسانی کی فلاح و بہبود، خوش حالی اور آزادی و ترقی کے لیے اقصائے عالم میں اپنی فتح و نصرت کے پرچم لہرائے ہیں۔ خود صعوبتیں، مصیبتیں اور تکلیفیں اُٹھا کر دوسروں کے لیے منارۂ نور ثابت ہوتی ہیں۔

ایسی ہی نڈر، دلیر اور ملک و قوم کی عزت و آزادی کے لیے مر مٹنے والیوں میں ایک مجاہدۂ وطن میڈم کاما بھی تھیں، جنھیں ابنائے وطن فراموش کرتے جا رہے ہیں اور ان کی بیش بہا خدمات طاقِ نسیاں ہوتی جا رہی ہیں۔

میڈم کاما کا عقیدہ تھا کہ "خدمت کرنے کا موقع ملنا قسمت و تقدیر پر منحصر ہے لیکن آنے والوں کے لیے، قوم کے لیے اور وطن کے لیے قربانی کرنا فرضِ انسانیت ہے۔" یہی جذبۂ قربانی تھا جس نے انھیں مادرِ ہند کی خدمت کے لیے کمربستہ کر دیا اور وہ تن من دھن سے وادیٔ پُرخار کو سرسبز و شاداب بنانے میں مصروف ہو گئیں

راہ رَوِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

انھیں اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی اور اس کے شان دار و تابناک مستقبل کے لیے انھوں نے کیسی کیسی تکلیفیں جھیلی ہیں اور کس کس طرح مصائب و آلام کو انگیز کیا ہے اس کا ہلکا سا اندازہ اس مضمون کے مطالعے سے ہوگا۔

۱۹۰۷ء میں جرمنی میں بین اقوامی سوشلسٹ کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ میڈم کاما اس اجلاس میں بڑے عجیب و غریب طریقے سے شریک ہوئیں۔ نہایت سنجیدگی و متانت کے ساتھ وہ یکایک پلیٹ فارم پر پہنچیں اور انھوں نے ایک دم اپنے بلاؤز سے ایک جھنڈا نکالا اور اس کو فخر و مسرت سے لہراتے ہوئے کہا: "یہ ہندوستان کی آزادی کا جھنڈا ہے، ہندوستان کی عظمت کا نشان ہے۔ یہ ہندوستان کے مقدس و بہادر شہیدوں کے خون سے پاک اور پوتر کیا گیا ہے، آپ صاحبان کھڑے ہو جائیے اور اس جھنڈے کو سلامی دیجیے۔" تقریباً ایک ہزار نمائندے اس اجلاس میں شریک تھے۔ وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت ادب و احترام سے اس قومی جھنڈے کو سلامی دی۔ یہ جھنڈا تین رنگوں پر مشتمل تھا۔ میڈم کاما نے اپنی تین رنگ کی مختلف ساڑیوں کو پھاڑ کر اسے بنایا تھا۔ اس کے وسط میں لفظ 'بندے ماترم' خوب صورت اور دیدہ زیب کلابتو سے کڑھا ہوا تھا۔

ہندوستانی قومیت کی پرستار میڈم کاما ۱۸۶۱ء میں بمبئی میں پیدا ہوئیں۔ آپ کو ابتداء ہی سے سماجی خدمت اور سیاسی تحریکات سے دل چسپی رہی۔ ۱۸۸۵ء میں بمبئی میں جو کانگریس کا

جلسہ ہوا تھا اس میں آپ نے شرکت کی تھی۔ ان کے شوہر رستم جی کاما مشہور سماج سدھارک کے۔ آر کاما کے فرزند تھے۔ شوہر کا رجحانِ طبع میڈم کاما سے بالکل مختلف اور بے میل تھا۔ وہ اپنے زمانہ کے مشہور و متمول وکیل تھے اور عیش و عشرت کی زندگی کے عادی۔ میڈم کاما اور شوہر کے درمیان ایک طرح بُعد المشرقین تھا۔ دونوں کے طریقۂ زندگی، سوچ و فکر، مقصد و مسلک میں زمین آسمان کا فرق تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میڈم کاما کا جذبۂ خدمت، احساسِ فرض اور دردِ وطن - عیش و عشرت، مسرت و کامرانی اور لذتِ کام و دہن پہ غالب آ گیا اور میڈم کاما نے عیش و آرام کی زندگی کو چھوڑ کر سادگی اور وطن کی راہ میں بادیہ پیمائی اختیار کر لی اور شوہر سے رشتۂ زوجیت بھی منقطع کر لیا اور اپنی متاعِ ملک و قوم کی خدمت اور عظمت کے لیے وقف کر دی۔

۱۹۰۱ء میں بمبئی میں سخت و خطرناک پلیگ پھیلا، لوگوں کی جانوں کے لالے پڑ گئے۔ سیکڑوں افراد اس موذی مرض کا شکار ہوئے۔ میڈم کاما نے اس نازک موقع پر مریضوں کی خدمت، دیکھ ریکھ اور تیمارداری اس تن دہی و انہماک سے کی کہ خود بھی موت کے دہانہ پر پہنچ گئیں مگر خدا نے مرنے سے بچا لیا۔ پھر بھی صحت اتنی گر گئی کہ علاج و تبدیلِ آب و ہوا کے لیے انھیں یورپ جانا پڑا۔ ۱۹۰۳ء میں آپ یورپ گئیں۔ جرمنی، فرانس اور ہالینڈ وغیرہ میں ایک سال رہیں، اس سلسلہ میں روس، مصر، اٹلی، ترکی، پولینڈ اور آئرلینڈ کے سیاسی مہاجرین سے ان کی ملاقات ہوئی، جس کی وجہ سے ان کے سیاسی خیالات میں اور زیادہ جلا پیدا ہوئی، یہیں ان کے دل و دماغ میں یہ احساس پیدا ہوا کہ "جب انسان صداقت، سچائی اور سنجیدگی سے یہ سوچنے لگتا ہے کہ میں آزادی، قوم، وطن اور انسانیت میں عقیدہ رکھتا ہوں تو وہ اس وقت تک ان کے لیے جد و جہد کرتا ہے جب تک اس کے جسم و جان میں آخری قطرۂ خون بھی باقی رہتا ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہ تمام تر اچھے اور مؤثر ذرائع و وسائل اختیار کرتا ہے اور وہ یہ جد و جہد محض اس لیے کرتا ہے کہ خاندانوں کے گلستانوں کی نوخیز کلیاں اور غنچے پھول بن کر سرسبز و شاداب ہوں۔"

۱۹۰۵ء میں جب تقسیمِ بنگال نے عملی جامہ پہنا تو اس کی مخالفت میں سارا دیش جو الاکھی بن گیا تھا چاروں طرف سے اس کی مخالفت ہوئی، ہندوستانیوں کے اس زبردست احتجاج کی صدائے بازگشت یورپ تک پہنچی۔ میڈم کاما کیسے ضبط کر سکتی تھیں انھوں نے وہیں سے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ ۱۹۰۶ء میں جب ساورکر لندن گئے تو وہاں انھوں نے حصولِ آزادی کے لیے ایک سوسائٹی قائم کی اور لندن کو اس جماعت کا مرکز بنایا۔ شروع میں یہ جماعت ہندوستان ہی میں ناسک میں قائم ہو چکی تھی جس میں ملک کے کئی بڑے بڑے آدمی شامل ہو چکے تھے۔ اسی غرض و غایت کی دوسری جماعت لندن میں قائم ہوئی اس میں بھی میڈم کاما نے سرگرم حصہ لیا اور اس تحریک کو چاروں طرف پھیلایا۔ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے لندن ہی میں ایک تجویز رکھی جس میں صاف صاف یہ کہا گیا تھا کہ "ہندوستان میں سلطنتِ انگلشیہ کا قائم رہنا ہندوستانیوں کے لیے تباہ کن ہے اور تمام دنیا میں آزادی سے محبت کرنے والوں کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ ہماری مانگ ہے کہ کوئی قوم، ظالمانہ حکومت کے پنجہ میں نہ رہے۔ ان کی تقریر کا آخری جملہ تھا کہ "انصاف کے لیے لڑو اور ہر سوشلسٹ جلسہ میں ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کو سامنے رکھو۔" ظاہر ہے کہ اس کی بھی مخالفت ہوئی اور یہ مخالفت لندن کے نمایندوں نے کی لیکن دوسرے ملکوں کے نمایندوں نے اس تجویز کو معقول و مناسب قرار دیا اور اس کی تائید و حمایت کی۔ صدر نے کہا "اس تجویز کی روح کے ساتھ کانگریس کی بہت بڑی اکثریت شامل ہے، کانگریس کی ہمدردی و حمایت نے ان کے عزائم میں استحکام پیدا کیا اور وہ بہت سا لٹریچر لے کر امریکہ پہنچیں اور وہاں کے عوام میں ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ پر بہت سی تقریریں کیں۔ امریکہ کے عوام جو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے اخبارات کے ذریعہ ان کی تقاریر و خیالات کو عوام میں پھیلایا جس سے ہندوستان کی آزادی کے لیے زمین ہموار ہو گئی۔ ادھر برٹش حکومت نے ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو دبانے کے لیے ظلم و تشدد

شروع کر دیا تھا۔ جب اس کی گونج امریکہ پہنچی تو میڈم کاما پیرس کے لیے روانہ ہو گئیں۔ وہاں انھوں نے ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں ہندوستانیوں کی حالتِ زار اور انگریزوں کے مظالم تفصیل سے ظاہر کیے۔ انھوں نے ہندوستانیوں کے لیے ایک اپیل روانہ کی۔ اس میں کہا تھا کہ "قدیم عظمت کی شیخی مارنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے جب ہندوستان غلامی کی حالت میں ہے، میدانِ کارزار میں آؤ اور سوراجیہ حاصل کر کے آزادی اور برابری کو قائم کرو، اگر ہم سب لالہ لاجپت رائے کی طرح بہادری سے قدم اُٹھائیں تو انگریز سرکار کتنے قلعے، کتنے کالے پانی، کتنی پھانسیاں اور کتنے جیل خانے بنوا سکتی ہے؟ ہم کو صرف اتفاق، یک جہتی اور ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ خدا ہندوستان کے باشندوں کے دل و دماغ میں وہ اتحاد و اتفاق پیدا کر دے جو بندے ماترم سے سرشار ہو۔" پیرس میں ان کا مکان سیاسی سرگرمیوں اور جلسوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اسی درمیان لندن میں ایک واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ وسودیو بھٹا چاریہ نے ایک انگریز کو بُری طرح پیٹ کر زخمی کر دیا۔ اس انگریز نے ہندوستانیوں کے لیے 'کم ظرف' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ بھٹا چاریہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ جیسے ہی یہ خبر میڈم کاما تک پہنچی وہ لندن کے لیے روانہ ہو گئیں اور وہاں جا کر بھٹا چاریہ کی رہائی کے لیے ضمانت دی۔ یہ ضمانت منظور ہو گئی لیکن بھٹا چاریہ بھی ایک بہادر مجاہد تھا اس نے ضمانت پر رہا ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ ان واقعات کا ردِ عمل ہندوستان میں برابر ہوتا جا رہا تھا۔ انقلابی پارٹی زور پکڑتی جا رہی تھی۔ مانک ٹولہ میں بم بنانے کا کارخانہ بھی قائم کر لیا گیا تھا۔ سب سے پہلا بم کلکتہ میں خودی رام بوس نے چلایا اس پر ان کی گرفتاری ہوئی اور انگریز سرکار کی طرف سے دار و گیر کی پالیسی تیز کر دی گئی۔ مدن لال ڈھینگرا نے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن کو مار ڈالنے کا پروگرام بنایا۔ لیکن ۱۹۰۹ء کی یکم جولائی کو جب حملہ کیا گیا تو سر کرزن وائیلی کو گولی لگی جس سے وہ ہلاک ہو گیے۔ مدن لال ڈھینگرا گرفتار کر لیے گئے۔ میڈم کاما نے مقدمہ لڑنے کی تیاری شروع کی اور وکیلوں کا انتظام کیا مگر ڈھینگرا نے مقدمہ لڑنے سے انکار کر دیا۔

اور پھانسی کی سزا ہوئی۔ ان کے بیان کا آخری حصہ ان الفاظ پر مشتمل تھا۔ — "خدا سے میری صرف ایک ہی گزارش ہے کہ میں ہندوستان میں دوسری بار جنم لوں اور اس وقت تک اسی طرح پیدا ہوتا رہوں جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو جائے۔ میں برابر جد و جہد کرتا رہوں اور مرتا رہوں۔ خدا کرے ہندوستان جلد آزاد ہو جائے۔" میڈم کاما اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئیں اور انھوں نے جرمنی سے 'تلوار' اور پیرس سے 'بندے ماترم' نام کا اخبار نکالا۔ اس اخبار کی پہلی اشاعت میں لالہ ہردیال نے لکھا تھا کہ "مستقبل میں جب سلطنت انگلشیہ خاک میں مل جائے گی۔ اس وقت ڈھینگرا کے بُت اور مجسمے ہندوستان کے شہروں کے چوراہوں کو رونق بخشیں گے جس سے ہمارے نوجوانوں کو ایک شریف اور باعزّت زندگی کا سبق ملے گا اور باعزت اور پوتر قربانی کی یاد آئے گی کہ کس طرح سے ڈھینگرا نے وطن سے دور، غیر ملک میں اپنے وطن کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی —" اس زمانہ میں کچھ دوسرے انگریز افسروں کو بھی انقلابیوں نے قتل کر دیا تھا اس لیے انگریز سرکار نے لندن میں مقیم ہندوستانیوں کو بڑی بڑی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائیں۔ اندھا دھند گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ویر ساورکر پیرس سے لندن کے لیے روانہ ہوئے لیکن انھیں وکٹوریہ اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ میڈم کاما نے انھیں رہا کرانے اور جیل سے غائب کرانے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہو سکی۔ تاہم لندن میں بڑی ہل چل مچ گئی۔ آخر ویر ساورکر کو موریہ نامی جہاز سے ہندوستان روانہ کیا گیا۔ لیکن وہ جہاز سے نکل کر سمندر تیرتے ہوئے فرانس کے بندرگاہ تک پہنچ گئے۔ انگریز ان کا پیچھا کر ہی رہے تھے۔ میڈم کاما اسی وقت فرانس پہنچیں لیکن کچھ ہی گز کا فاصلہ رہ گیا کہ ساورکر گرفتار کر لیے گئے اور پھر انھیں ہندوستان لایا گیا۔ میڈم کاما نے فرانس سرکار کو متوجہ کیا کہ انگریزوں کو ساورکر کو فرانس کی سرزمین پر گرفتار کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ مگر فرانس سرکار نے کوئی توجہ نہیں کی۔ بعد ازاں وہ فرانس کی سوشلسٹ پارٹی کے صدر مسٹر لیس اور ان کی مدد سے

فرانس میں ایک تحریک چلائی جس سے فرانس سرکار مجبور ہو گئی اور اس نے ہیگ کی عدالت میں انگریزوں کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ اس مقدمے میں میڈم کاما نے بڑی سرگرمی دکھائی اور بڑی دوڑ دھوپ کی۔ انھوں نے یورپ کے مشہور سوشلسٹ وکیلوں کی خدمات حاصل کیں۔ لیکن ہیگ عدالت کا فیصلہ انگریز سرکار کے حق میں ہوا اور ساورکر پر بمبئی میں مقدمہ چلایا گیا۔ میڈم کاما نے فرانس سے اس مقدمہ کے لیے بہترین اور ماہر قانون دان وکیل روانہ کیے۔ مگر انگریز سرکار نے انھیں رہا کرنے کے لیے تھوڑا ہی گرفتار کیا تھا، کالے پانی کی سزا دی گئی۔ اس سلسلہ میں کوپن ہیگن میں تمام یورپ کی سوشلسٹ پارٹی کا سالانہ جلسہ ہوا میڈم کاما نے ہندوستان کی آزادی کی تجویز کے ساتھ ساورکر کی رہائی کی بھی تجویز رکھی جو اتفاق رائے سے منظور ہوئی لیکن انگریز سرکار نے مسٹر ساورکر کو رہا نہیں کیا۔

ہندوستان کو جلد آزاد کرانے کے لیے جو غدر پارٹی بنائی گئی تھی، اس کے بہت سے ممبر گرفتار کر لیے گئے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس اس امر کی جانچ کر رہی تھی کہ ہندوستان میں بم اور پستول کس طرح پہنچتے ہیں۔ میڈم کاما نے پیرس میں مقیم لندن کے سفیر کو اپنا دستخطی خط دیا جس میں ہندوستان میں اسلحہ پہنچنے کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہونے والی تھی۔ انگلینڈ کی سرکار نے فرانس سرکار کو مجبور کیا کہ وہ میڈم کاما کے اخبار بندے ماترم کو ضبط کرے اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کرے۔ فرانس سرکار نے اخبار کو ضبط کر لیا اور میڈم کاما کو حراست میں لے لیا۔ ادھر لالہ ہردیال اور چٹو پادھیائے جرمنی پہنچے۔ وہاں جرمن سرکار کی امداد سے انھوں نے ہر قسم کے ہتھیار ہندوستان روانہ کیے۔ اس زمانہ میں بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے۔ سنگاپور، رنگون اور ہانگ کانگ میں ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت، لاہور سازش کیس وغیرہ۔ ہندوستان میں بہت سے شہید وطن پھانسی کے تختوں پر چڑھائے گیے۔ بہتوں کو عمر قید کی سزائیں دی گئیں۔ جب پہلی جنگ عظیم بالکل ختم ہو گئی تب کافی عرصہ کے بعد ہندوستانیوں کو یورپ میں آزاد کیا گیا۔ میڈم کاما کو بھی رہا کر دیا گیا۔ اس وقت فرانس کے سکے کی قیمت بہت گر چکی تھی۔ اس سے قبل بھی انقلابی تحریکوں پر انھوں نے بڑی بے جگری اور فیاضی سے روپیہ خرچ کیا تھا۔ اب ان کی مالی حالت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ صحت بھی بہت گر گئی تھی۔ اب وہ کچھ کام کرنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ انھوں نے ہندوستانیوں کو اپنی آخری اپیل بھیجی جس میں کہا گیا تھا کہ "زندگی میں میری بس ایک یہی آخری خواہش ہے کہ ہندوستان جلد آزاد ہو۔ ہندوستان کے بزرگ دوستو! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ ہندوستان کے غریب مفلوک الحال لوگوں، بچوں اور نوجوانوں کو غلامی پستی اور ذلت و خواری سے نکالو اور ان کو عزت، ترقی، خوش حالی اور سوراجیہ کے راستے پر لے جاؤ۔" ۱۹۳۶ء میں یورپ پر جنگ کے بادل پھر منڈلانے لگے۔ انگریز سرکار نے لالہ ہردیال اور میڈم کاما کو ہندوستان آنے کی اجازت دے دی۔ میڈم کاما ہندوستان آئیں لیکن ان کی صحت اب زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ آپ جہاز سے سیدھی پارسی جنرل ہسپتال بمبئی پہنچا دی گئیں جہاں پورے غور و توجہ سے آپ کا علاج کیا گیا مگر صحت نصیب نہ ہو سکی۔ اور جلد ہی وہ اس دنیا سے سدھار گئیں۔ ان کا جوش و جذبہ اولوالعزمی و حب الوطنی اور ایثار و قربانی، قوم کے لیے پیغامِ عمل اور منارہ کا کام دے گی — اور ہندوستان کی تاریخ ایسی حریت پرور خواتین پر ہمیشہ فخر و ناز کرے گی۔

چھوٹا ناگ پور کے آدی باسی

چھوٹا ناگ پور ریاست بہار کی ایک کمشنری ہے اور اس کمشنری کے شمال میں پٹنہ اور بھاگل پور کی کمشنریاں، جنوب میں اڑیسہ، مشرق میں مغربی بنگال اور مغرب کی طرف اتر پردیش ہے۔ اس کمشنری میں رانچی، پلاموں، ہزاری باغ، سنگھ بھوم اور مان بھوم کے پانچ اضلاع شامل ہیں۔

پلاموں ضلع بلکہ چھوٹا ناگ پور کا پورا علاقہ اپنے جلو میں خوشنما نظاروں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ پہاڑ اور اس کے دامن ساگوان کے لمبے لمبے درختوں اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کی سبز پتیوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ جنگلی جانور جنگل میں منگل مناتے ہیں۔ شیروں کی گرج چڑیوں کی چہچہاہٹ، ہرنوں کی چوکڑی اور بھیڑ بکریوں کے بچوں کی اُچھل کود ان علاقوں کے کوہستانی کردار ہونے کے ناتے ہر لمحہ ہر شانیہ اپنا اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں۔

یہاں کی آب و ہوا سرد ہے۔ جون جولائی میں بھی یہاں گرم چادر کے بغیر رات گزارنی محال ہے۔ دسمبر اور جنوری میں تو قیامت کی سردی ہوتی ہے۔ موسم گرما میں یہاں دن کو لو نہیں چلتی۔ موسم تقریباً سارا سال خوش گوار رہتا ہے۔ اس ضلع کی پیداوار زیادہ تر گیہوں، جو، چنا، مکی، مٹر اور سرسوں وغیرہ ہیں۔ پھلوں میں کٹھل، آم اور مہوہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس وقت بہار میں ۲۹ آدی باسی قبیلے (شیڈول ٹرائبس) آباد ہیں۔

مصنف "بہار تھرو دی ایجز" (Bihar through the Ages) لکھتے ہیں — یہ آدی باسی چھوٹا ناگ پور کے پانچ ضلعوں، رانچی، ہزاری باغ، مان بھوم، سنگھ بھوم اور پلاموں میں آباد ہیں۔ ان کے علاوہ سنتھال پرگنہ کے ضلعوں، سہسرام سب ڈویژن کے پہاڑی علاقوں ببھوا، بھاگلپور، مونگیر، پرنیا، اور چمپارن میں بھی ملتے ہیں۔

چھوٹا ناگ پور کے جن علاقوں کا میں نے دورہ کیا وہاں صرف کوروا، منڈا، اراؤں، کسان اور کھیروا آدی باسی ملتے ہیں۔ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف چھوٹا ناگ پور بلکہ پورے ہندوستان میں بسنے والے دو کروڑ آدی باسی اصلی نسل کے نہیں ہیں۔ ان کے جدامجد وسط ایشیا سے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وہ اپنے اور اپنے مویشیوں کے لیے جہاں جہاں چارہ دیکھتے گئے آباد ہوتے گئے۔ لیکن مقامی لوگوں نے ان آدی باسیوں کو آبادی کے علاقوں میں بسنے نہ دیا اور انھیں جنگل میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ تب سے لے کر آج تک یہ آدی باسی جنگلوں میں ہی آباد ہیں۔

کوروا

یہ قبائلی کوروا ٹول میں رہتے ہیں۔ یہ گاؤں انھیں کے نام سے موسوم ہو گیا ہے۔ ان کے پرانے لوگوں نے ہمیں بتایا کہ ان کے بزرگ لنکا سے آئے۔ لیکن کب اور کس طرح، یہ ایک پہیلی ہے جو اب تک سلجھ نہیں سکی۔ کوروا کی حیثیت اچھوتوں کی سی ہے۔ ان کے ساتھ

دوسرے قبیلے کے آدمی باسی خلط ملط نہیں ہوتے - وہ ہمارے
یہاں کے جاروب کشوں سے مشابہ ہیں - ان کے جسم
گٹھے ہوئے، اعضا مضبوط اور سخت ہوتے ہیں - یہ بڑے محنتی ہوتے
ہیں - عام طور سے قد میں یہ پانچ سے ساڑھے پانچ فٹ کے ہوتے
ہیں - مردوں کی مونچھیں اور داڑھی منڈی ہوتی ہیں - مرد اور
عورت دونوں کے کان چھدے ہوتے ہیں جن میں موٹے موٹے
نرکٹ کے ٹکڑے پھنسے ہوتے ہیں - یہ لوگ تسبنا (جنگلی مرغی)
مجور (مور) سمبھا (خرگوش) چاری (چڑیا) بڑے شوق سے
کھاتے ہیں - جھورتی، گیتو اور کسم ان کی مرغوب مچھلیاں ہیں -
صبح کے ناشتہ کو یہ لوگ "کوزوا" لقمہ کہتے ہیں تقریباً
ایک پاؤ مہوا کھاتے ہیں - دوپہر کے کھانے کو "کلیوا" کہتے ہیں
اس میں مہوا، مٹھا، سبزی اور کچھ خاص قسم کی ابلی ہوئی جڑیں
جوار یا باجرہ، چاول، کودو وغیرہ ہوتا ہے - رات کے کھانے کو یہ
"بیاری" کہتے ہیں - اس میں وہی تمام چیزیں ہوتی ہیں جو دوپہر کے
کھانے میں ہوتی ہیں - البتہ اس میں مکی کا اضافہ ہوتا ہے - کوروا
لوگ نمک کی بنی ہوئی چیز اتوار کو نہیں کھاتے ہیں - گھر میں جو سب
سے بڑا ہو یا جو مہمان آیا ہو اسے سب سے پہلے کھلاتے ہیں - اس
کے بعد عورتیں اور بچے - عورتیں اپنے شوہروں کے سامنے نہیں
کھاتی ہیں - یہ لوگ پتوں کے بنے ہوئے برتن میں کھاتے ہیں جسے
وہ "دونا" کہتے ہیں - کہیں کہیں خام المونیم کے بھدے برتن بھی
استعمال میں لائے جاتے ہیں -

منڈا

ان کی تعداد سوہر میں کثیر ہے - منڈا کوروا کی طرح یہ شکاری
نہیں ہوتے بلکہ کاشتکار ہوتے ہیں - کاشتکاری ہی ان کا
ذریعۂ معاش ہے - ویسے کبھی کبھی تفریحاً شکار بھی کر لیتے ہیں -
یہ مافوق الفطرت طاقتوں میں یقین رکھتے ہیں "سنگ بونگا"
ان کی سب سے بڑی ہستی ہے - خاندان یا گاؤں میں جب کبھی
ناگہانی یا زبردست مصیبت آتی ہے تو ایک سفید مرغ کی قربانی
دی جاتی ہے - یہ لوگ بد ارواح میں بھی یقین رکھتے ہیں - جب یہ
کسی بد روح کے چکر میں پھنس جاتے ہیں تو اوجھا جسے یہ لوگ
"دیونارا" یا "متی" کہتے ہیں اس سے علاج کراتے ہیں - ہندو
دھرم کے ماننے والے منڈا، سورج، آسمان، پہاڑ، دریا اور
کنوئیں وغیرہ کی پوجا کرتے ہیں -

جسمانی لحاظ سے کوروا کے مقابلے میں منڈا قدرے چھوٹے
ہوتے ہیں - کوروا آدی باسیوں کی طرح ان کا جسم سڈول بھی
نہیں ہوتا بلکہ بے ہنگم ہوتا ہے - ان کی ناک پھیلی ہوئی اور پیشانی
بہت چوڑی ہوتی ہے - ہونٹ بڑے موٹے ہوتے ہیں لیکن مزاج
کے دھیمے ہوتے ہیں -

کھیروار

یہ بھی سوہر میں آباد ہیں - ان کی جلد موٹی اور
رنگ سیاہ ہوتا ہے - منڈا اور کوروا کی طرح کھیروار چست نہیں
بلکہ بڑے ہی سست ہوتے ہیں - اگرچہ ان کا ذریعہ معاش کاشتکاری
ہے پھر بھی یہ کھیتوں میں محنت سے کتراتے ہیں - اور گھروں میں
بیٹھ کر وقت گزار دیتے ہیں -

کھیروار گائے بھینس نہیں کھاتے - بھیڑ کے گوشت سے
بھی یہ حتے الامکان پرہیز کرتے ہیں - کھیروار کے یہاں ایک قابل غور
بات یہ ہے کہ یہ صرف اپنے ہی قبیلے کے اندر کھا پی سکتے ہیں باہر
نہیں - ان کے یہاں ایک طرح کا عہد ہوتا ہے جس کے تحت نہ تو وہ
اپنے قبیلے سے باہر کھا پی سکتے ہیں اور نہ شادی بیاہ کر سکتے ہیں -

کسان

یہ اپنے آپ کو راجپوت کہتے ہیں اور اپنی نسل ڈراویڈوں
سے منسلک کرتے ہیں - یہ سیاہ فام اور بڑے محنتی ہوتے ہیں -
اس لیے ان کا جسم بڑا گٹھا ہوا ہوتا ہے - یہ بھی کاشتکاری کو ترجیح
دیتے ہیں - کچھ نہیں تو بیکاری کے زمانے میں یہ دوسروں کے
کھیتوں میں ہل چلائیں گے اور اس کی مزدوری سے گزر اوقات
کریں گے - ان کے بال لمبے اور چھلے دار ہوتے ہیں - ان کی بعض
لٹیں تو دو دو تین انچ قطر میں موٹی ہوتی ہیں - یہ داڑھی، مونچھ
کچھ بھی نہیں رکھتے - یہ بڑے ہی سادہ لوح اور سچے ہوتے ہیں -

گائے بھینس کے علاوہ قریب قریب ہر جانور کا گوشت کھاتے ہیں۔

اُراؤں

بلحاظ جسمانی ساخت مثلاً آدی باسیوں سے مشابہ ہیں۔ ان کا چہرہ گول ہوتا ہے۔ ناک پھیلی ہوئی سپاٹ ہوتی ہے۔ جبڑے بڑے مضبوط اور پیشانی کم چوڑی ہوتی ہے۔ ان کی آنکھیں زیادہ تر سیاہ پتلیوں والی ہوتی ہیں۔ ان کا قد لمبا ہوتا ہے اور ان کے بال سیاہ اور موٹے ہوتے ہیں۔ چرچ عیسائی اراؤں کی عبادت گاہ ہے اور 'سارنا' ہندو اراؤں کی۔

دوسرے آدی باسیوں کی طرح اراؤں بھی خواہ وہ عیسائی ہوں یا ہندو زیادہ تر زراعت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جن کے پاس زمین نہیں ہے وہ جنگلوں میں شکار کرتے ہیں۔

آدی باسی نوجوان اپنے بزرگوں کے فرماں بردار ہیں۔ ہر گاؤں میں پنچایتی رواج ہیں۔ سب آدی باسی اپنے اپنے قبیلے میں سے اپنا ایک سردار چنتے ہیں اور اسی کے فیصلے پر عمل کرتے ہیں۔ اراؤں اپنے پنچایتی طریقے کو 'پرہا' کہتے ہیں۔ یہ پرہا مختلف گاؤں کے اراؤں کو ایک دھاگے میں باندھتا ہے۔ ان کی سماجی زندگی کی نگرانی کرتا ہے اور جھگڑوں کو اپنے فیصلے کے ذریعے طے کرتا ہے۔ ویسے تو ہر قبیلے کے آدی باسی اپنی اپنی پنچایت بلاتے ہیں۔ لیکن جب کوئی خاص مسئلہ سامنے آجاتا ہے تو ایسی حالت میں سارے آدی باسی مل کر ایک پنچایت بلاتے ہیں۔ اور کسی کھلے میدان یا کسی گھنے درخت کے نیچے تمام قبیلوں کے آدی باسی اپنے اپنے مکھیاؤں کے ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ مکھیا آپس میں اتفاق رائے سے اپنے ہی میں سے ایک سرپنچ چن لیتے ہیں۔ اس سرپنچ کے فیصلے کو سارے لوگ مانتے ہیں۔

آدی باسیوں میں شادی کے کئی طریقے رائج ہیں۔ ان میں سے ایک عام طریقہ یہ ہے کہ جب کسی لڑکے کی شادی کرنا مقصود ہو تو ایک درمیانی آدمی کو لڑکی کے باپ کے گھر بھیجا جاتا ہے جو جہیز وغیرہ طے کرتا ہے۔ جہیز میں شراب کی ہانڈی کی مقدار طے کی جاتی ہے جسے وہ "ہنڑیا" کہتے ہیں۔ کھانے کے بعد بچے ہوئے چاول، دیگر اناج، کیڑے مکوڑے، جڑی بوٹیاں اور ان کے علاوہ اور بہت سے جنگلی پھلوں کو وہ مٹی کی ایک ہانڈی میں رکھ کر اس کا منہ اچھی طرح بند کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ تقریباً ایک ماہ تک اسے دھوپ میں رکھتے ہیں۔ دھوپ کی گرمی سے اس میں تیزی آجاتی ہے۔ شادی کے موقع پر اگر "ہنڑیا" پیش نہ کیا جائے تو دعوت نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ خاندان کی فارغ البالی اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ وہ کتنا زیادہ شراب کی ہانڈی (ہنڑیا) دینے کی ہمت رکھتا ہے۔ ہنڑیا بطور جہیز طے ہو جانے کے بعد دونوں فریقوں میں تحفے کا تبادلہ ہوتا ہے۔ شادی کے دن لڑکے والے برات لے کر بڑے کروفر سے دلہن کے گھر آتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ دونوں طرف کے مہمانوں کی خاطر تواضع نوشہ کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اس کا بار دلہن کے گھر والوں پر نہیں پڑتا۔ برات آجانے کے بعد دولھا دلھن کو ایک ٹوکرے میں اٹھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد دولھا دلہن کی پیشانی پر سیندور ڈالتا ہے۔ بغیر سیندور کے شادی مکمل نہیں ہوتی۔

شادی بیاہ کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خود لڑکا لڑکی والوں کے یہاں رہنا شروع کر دیتا ہے۔ گویا وہ دلہن کے خاندان کا ایک فرد بن جاتا ہے۔

تیسرے طریقے کے مطابق دولھا اپنے خسر کے یہاں پانچ سال تک رہتا ہے۔ اس کے بعد دلہن کے ساتھ اپنے گھر واپس آجاتا ہے۔

آخری طریقہ یہ ہے کہ دلہن کو دولھا کے گھر بھیج دیا جاتا ہے جہاں شادی ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں برات وغیرہ نہیں جاتی۔ یہ طریقہ بہت ہی غریب آدی باسیوں میں رائج ہے۔

اراؤں میں ایک شادی کا رواج ہے لیکن طلاق دینے اور بیوی کو دوبارہ شادی کرنے کی پوری آزادی ہے۔ ان کے یہاں "دھم کریا" نام کا ایک عجیب و غریب رواج ہے۔ یہ ایک مقام ہوتا ہے جہاں جوان لڑکے اور لڑکیاں آپس میں بغرض شادی اظہارِ محبت کرتے ہیں۔

منڈا قبائل میں بھی ایک شادی کا رواج ہے لیکن ان کے یہاں دوسری شادی بھی کی جا سکتی ہے۔

کوروا کئی شادیاں کر سکتے ہیں لیکن تین سے زیادہ نہیں۔ وہ بھی اس شرط پر کہ پہلی بیوی اور دوسری بھی بانجھ ہو تو تیسری بیوی لائی جا سکتی ہے۔

کھیروار اپنی بساط کے مطابق شادیاں کرتے ہیں۔ ان کے یہاں طلاق کا رواج نہیں ہے۔ نابالغوں کی شادی نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں لڑکی کی شادی کی عمر ۱۲ سال ہے جبکہ دوسرے قبائل میں یہ قید نہیں ہے۔

آدی باسیوں میں کئی طرح کے مذاہب ہیں۔ عام طور سے مشنریز کا اثر زیادہ ہے اور وہ کسی سوال کا جواب پادری سے پوچھے بغیر نہیں دیتے۔ اس سلسلے میں ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ آج جبکہ آمد و رفت کی اتنی سہولتیں میسّر ہیں پھر بھی یہ علاقے آبادی سے بالکل الگ تھلگ ہیں اور اگر بارش ہو تو ہر طرف پانی بھر جاتا ہے۔ دورِ حاضرہ میں بھی آبادی اور پہاڑی علاقے ایک دوسرے سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں اور ایک کو دوسرے علاقے کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ آج سے تقریباً ۹۰ سے سال قبل کون سا ہمہ جو عیسائی ہوگا جو اس جنگل میں آکر رہا ہوگا اور جس نے ہواڈانڈ میں ایک چرچ بنوایا ہوگا۔ آدی باسیوں کی آبادی کا بیشتر حصہ عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ بہر حال دوسرے آدی باسی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اپنے دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں مثلاً کسان آدی باسی 'دیوی' کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کی فصل اچھی ہو، اس لیے وہ کھیتوں میں جا کر مرغ، مرغی یا چوزہ یا بکرے کی قربانی کرتے ہیں۔ کوروا آدی باسی اپنی فصل اور اپنی زندگی کو خوش حال بنانے کے لیے ٹونگو دوار پر اور رسکل کے حضور میں بکری کے بچّے اور آٹے کی روٹی وغیرہ نذر کرتے ہیں۔ ان کے اعتقاد کے مطابق خوشی یا غم انھیں دیوتاؤں کی خوشی یا ناراضگی کی وجہ سے ملتا ہے۔

مردہ رشتہ داروں کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔ کھیروار، دہگن، دربا، چنڈی وغیرہ کو خوش کرنے کے لیے سور، بکرے یا مرغ کی قربانی دیتے ہیں۔ غیر عیسائی اراؤں آدی باسیوں کے یہاں دس قابلِ پرستش خدا ہیں، جن میں سب سے بڑا خالق ہے جس نے ساری کائنات کی تخلیق کی ہے۔ منڈا کا سب سے بڑا دیوتا سنگ بونگا ہے۔ ان کے اعتقاد کے مطابق اگر دیوتا خوش ہوں تو پیداوار اچھی ہوتی ہے اور خانگی زندگی پُرسکون گزرتی ہے۔

چھوٹا ناگ پور کے آدی باسیوں کے تہوار نہایت اہم ہیں ایک تو ماگھ (موسم سرما) میں جب ان کی فصل تیار ہو جاتی ہے اور اناج کھلیان میں جمع کر لیتے ہیں۔ اور دوسرا پھاگن (موسم گرما) میں جبکہ ساگوان کے درخت پورے شباب پر ہوتے ہیں، تیسرا تہوار سرہل ہے اور اسے تمام آدی باسی مناتے ہیں۔ یہ تہوار ایسے ہی ہے جیسے مسلمانوں میں عید، عیسائیوں میں بڑا دن اور ہندوؤں میں ہولی۔ سرہل آدی باسیوں کا گویا قومی تہوار ہے جسے چھوٹے بڑے، امیر، غریب، اونچی اور نیچی ذات کے آدی باسی مناتے ہیں۔ اس تہوار کی اہمیت اتنی ہے کہ اس دن ریاست بہار میں تمام سرکاری دفاتر بند رہتے ہیں۔ سرہل کے موقع پر تمام آدی باسی عورتیں، مرد اور بچّے گھنے درختوں کے نیچے یا کھلے میدان میں جمع ہوتے ہیں اور رقص کرتے ہیں۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے رقص کرتے وقت آگے کی طرف جھکتے ہوئے بڑھتے ہیں اور پھر گردن اٹھا کر پیچھے کی طرف ہٹتے ہیں۔ کہیں کہیں صرف عورتوں اور کہیں کہیں صرف مردوں کی ٹولی ہوتی ہے۔ سارے بوڑھے عام طور پر تماشائی ہوتے ہیں۔ شراب و ناب میں ڈوبے ہوئے یہ آدی باسی دف، کھجری، نگاڑا، منذر، اور بنسری کی سروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر لوک گیت گاتے ہوئے رات گزار دیتے ہیں۔ وہ رات ان کی بے حد مسرّتوں اور امنگوں کی رات ہوتی ہے اور اس رات غم و الم کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔

یہ آدی باسی عام طور سے اراؤں اور منڈا زبان بولتے ہیں۔ یہ زبان بھی جیودی یا مگھی زبان سے بالکل مختلف ہے لیکن یہ آدی باسی ہندی زبان کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً پانی کو جل، گائے کو گئو، بارش کو برکھا، گھی کو گھیو، مکھن کو ماکھن وغیرہ۔ ان کی زبان کے کچھ خاص الفاظ ہیں جن کے تلفظ بھی ان کی اپنی

زبان کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً مینو یا مور کو 'سجور' چڑیا کو 'چرئی'، چوہا کو 'مُسں'، خرگوش کو 'لبھا'، تیر کو 'سار'، کمان کو 'دھنک'، کلہاڑی کو 'کابی'، ٹوکرا کو 'ارا'، ٹوکری کو 'اڑی'، چھری کو 'پانسول' چٹائی کو 'چٹئی'، کھاد کو 'مینڈ' وغیرہ

ان کے مکانوں کی اونچائی ۴ سے ۶ فٹ ہوتی ہے۔ بانس کے ٹکڑوں کو کھڑا کرکے گوبر اور مٹی سے لیپ دیتے ہیں اور اوپر پھوس کی چھت ڈال دیتے ہیں۔ عام طور سے ایک کوٹھری ہوتی ہے اور اس کے باہر تھوڑا سا آنگن ہوتا ہے جس کے چاروں طرف کمر تک مٹی کی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ اسی کے اندر ایک طرف سور یا مرغی کا ڈربہ اور دوسری طرف رسوئی گھر بنا دیتے ہیں۔ اندر اور باہر گوبر سے لپی ہوئی زمین ہوتی ہے۔ بعض آدی باسیوں کے گھر کے آنگن میں گائے یا بھینس بندھی رہتی ہے

تین گاؤں میں بسنے والے تقریباً ۵۰۰ آدی باسیوں میں حجام بھی ہیں اور لوہار بھی، رعیت بھی ہیں اور مالک بھی، زراعت پیشہ اور بنیئے بھی ہیں۔ ہفتے میں دو بار ہواڈانڈ اور ہولاب میں لگنے والے بازاروں میں یہ آدی باسی عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے جوق در جوق جاتے ہیں اور چیزیں خریدتے ہیں۔

ان کا ذریعہ معاش جنگلوں میں شکار کرنا، لکڑیاں جمع کرنا، ٹوکریاں بنانا، شہد نکالنا، تپائی بنانا، مزدوری کرنا، مٹی کے برتن بنانا، کپڑے بُننا، لکڑی اور لوہے کا کام کرنا وغیرہ۔ قدرت کی آغوش میں پلنے والے ان آدی باسیوں کی زندگی بظاہر جتنی خوشگوار معلوم ہوتی ہے، لیکن وہ ابھی بہت پس ماندہ ہیں۔ انھیں معقول طبی امداد نہیں ملتی۔ عطائیوں نے کتنی ہی زچہ اور بچہ کی جانیں تلف کر دی ہیں۔ ان کے بچے دن بھر یونہی آوارہ پھرتے ہیں۔ یہاں تعلیم کا انتظام نفی کے برابر ہے۔ پانی کی بھی قلت ہے۔ مہاجنوں کے قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ ان کی فصل عام طور سے اچھی نہیں ہوتی اور نہ ہی انھیں بڑھیا قسم کی کھاد میسر ہے۔ نہ ہی تیار فصلوں پر کیڑوں سے بچانے کے لیے کرم کش دوائیں چھڑک سکتے ہیں۔ ان کی جھونپڑیاں موسم سرما کی سردی اور برسات کی تیز دھار کی تاب نہیں لاتیں۔ لیکن ان تکلیفوں کے باوجود ہمارے یہ آدی باسی جنگل میں منگل مناتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح ضروریات زندگی کی چیزیں مہیا کر ہی لیتے ہیں۔

چھوٹا ناگ پور میں اجتماعی ترقی کے کثیرالمقاصد منصوبوں کے تحت حکومت بہار نے ان آدی باسیوں کی حالت کو سدھارنے کی طرف کافی توجہ کی ہے۔ کئی جگہ اسکول کھول دئے گئے ہیں اور پتھریلی جگہوں کو کھود کر کنوئیں بنا دئے گئے ہیں۔ اینٹ اور چونے سے پختہ مکان بن رہے ہیں۔ کاشتکاروں کی سہولت کے لیے حکومت اچھے قسم کے بیج مہیا کرتی ہے۔ کم سود پر قرض دینے کے لئے کوآپریٹو بنک بھی کھول دئے ہیں۔ دواخانے بھی ہیں اور وئید بھی۔ آپس کے لڑائی جھگڑوں کو روکنے اور امن وامان قائم رکھنے کے لیے ایک تھانہ بھی ہے جہاں ہر وقت پولیس موجود رہتی ہے۔ تفریح کی خاطر ہفتے میں تقریباً چار بار گاؤں گاؤں میں فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ حالاتِ حاضرہ سے واقف ہو سکیں۔ حکومت ہر سال ان کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے سروے کراتی ہے اور اس کے مطابق کام کرتی ہے۔

ان آدی باسیوں میں زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی زمین ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی زمینوں کو زیادہ سے زیادہ قابلِ کاشت بنایا جائے۔ اس کے لیے حکومت جدید طریقوں کو بروئے کار لائے۔ لیکن پہلے ان طریقوں سے آدی باسیوں کو روشناس کرایا جائے۔ ان کی تعلیم کی طرف مزید توجہ کی ضرورت ہے تاکہ یہ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس کے لیے ہمیں ان کے جذبات، احساسات، اعتماد، یقین، رسم و رواج، طور طریق، تمدن و روایات اور ان کی بے خانماں زندگی کو اپنے سامنے رکھنا ہوگا۔ زبان اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے جس کے بغیر کوئی ترقی ناممکن ہے لہٰذا ان علاقوں میں ایسے کارکنوں کو بھیجا جائے جو ان کی زبان سیکھیں اور بڑی ہمدردی اور لگن کے ساتھ کام کریں تاکہ یہ آدی باسی جمہوریہ ہند کے بہترین شہری بن سکیں۔

نعیم زبیری

برف اور آنسو

سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ گلی کے نکڑ پر بجلی کے کھمبے سے لٹکے ہوئے بلب کی کرنیں بھی یوں لگتا تھا جیسے سردی سے ٹھٹھر گئی ہوں۔ گلی میں دن رات گونجنے والی آوازیں بھی جیسے جم کر سناٹے کی برف میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ سلیم کے گھر کے سامنے سونے والا کتا بھی سردی سے بچنے کے لیے کہیں اور چلا گیا تھا۔ سلیم نے اپنا سوتی گلوبند سر اور گردن پر مضبوطی سے لپیٹ رکھا تھا۔ پتلون کی جیب میں دبکا ہوا ہاتھ اگر بھولے سے دس نئے پیسے کے اس سکّے سے مس ہو جاتا جو پتہ نہیں کیسے جیب میں بچ رہا تھا تو انگلیوں میں سوئیاں سی چبھ جاتیں۔

اس کے چھوٹے سے گھر کا دروازہ روز کی طرح آج بھی کھلا تھا۔

"کون سی خاص چیز گھر میں دھری ہے جو کوئی لے جائے گا۔"

اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا جو پہلے پہل بڑی احتیاط سے دروازہ بند کر کے سویا کرتی تھی اور پھر جوانی کی نیند میں اتنی کھو جاتی تھی کہ وہ گھنٹوں دروازہ کھٹکھٹایا کرتا مگر کروٹ تک نہ لیتی — ابھی وہ بوڑھی تو نہیں ہوئی تھی۔ لیکن فکروں کے زہر نے اس کے خون کی گرمی کو چوس لیا تھا اور اب یہ حال تھا کہ اگر چوہا بھی ادھر سے اُدھر دوڑ جاتا تو وہ گھبرا کے جاگ پڑتی۔

"کون ہے؟"

اس نے دروازے کی آہٹ پا کے پوچھا — اور پھر مطمئن ہو کر اپنی ٹانگوں کو جو چادر کے باہر نکل آئی تھیں سکیڑ لیا اور بچّی سے لپٹ کر سو گئی۔ بچّی نے سوتے ہوئے ایک سسکی لی اور پھر در و دیوار پر خاموشی چھا گئی — چھوٹے سے کروسین لیمپ کی مدھم مدھم روشنی کمرے کے اندھیرے کونوں میں لٹکے ہوئے مکڑی کے جالوں میں چھپ جانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

سلیم نے سفید قمیص اتار کر اس کی جگہ پھٹا ہوا بشرٹ پہن لیا جسے اب وہ باہر پہن کر نہیں جا سکتا تھا اور پتلون اُتارنے سے پہلے اس نے جیب میں بچا ہوا دس نئے پیسے کا اکلوتا سکہ نکالا اور طاق میں رکھے ہوئے سگریٹ کے ٹن میں ڈال دیا جس کا ڈھکنا ٹانکا لگا کر بند کر دیا گیا تھا — ٹن کافی وزنی ہو چکا تھا — اسے ہتھیلی پہ رکھ کر تولتے ہوئے سلیم کی آنکھوں میں مسرّت کی چمک سی آ گئی۔ اس نے ٹن کو جلدی سے بستر کے کونے کے نیچے چھپا دیا، جیسے اب اسے ڈر ہو — کوئی لے نہ جائے اسے۔

کونے میں لکڑی کی ایک پرانی تڑے میں رکھا ہوا کھانا جلدی جلدی کھا کر وہ خود بھی اسی چادر میں پہنچ گیا جس کے نیچے اس کا خاندان سو رہا تھا۔

"روحی"

اس نے اپنی بیوی کے کان میں چپکے سے کہا

"کل بلینکٹ آ جائے گا۔"

اور بڑے اعتماد سے بستر کے اس ابھرے ہوئے کونے کو تھپتھپایا جس کے نیچے سگریٹ کا ٹن چھپا ہوا تھا۔ ریحانہ نے آنکھیں بند کیے ہی

آہستہ سے 'ہوں' کی اور چادر کو کانوں تک کھینچ کر پھر سو گئی - وہ خود بھی آج بڑے اطمینان سے سویا - بلینکٹ کے تصور ہی سے سردی کچھ کم ہو گئی تھی -

سلیم ایک دبلا پتلا سا نوجوان تھا - ہر وقت ہنسنے ہنسانے والا - جس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے لوگ اپنے سارے غم بھول جاتے - آج کل وہ جس فرم میں ملازم تھا وہاں اسے صرف اسّی روپے ملتے تھے لیکن کوئی یہ محسوس تک نہ کر سکتا تھا کہ اسے کوئی تکلیف ہے -!! ڈبلے پتلے جسم پر ایک کم قیمت لیکن اتنا ہی صاف ستھری قمیص اور خاکی پتلون پہنے جب وہ آفس پہنچتا تو سب سے پہلے اکاؤنٹنٹ کی اداس آنکھوں میں اسے دیکھ کر چمک سی آ جاتی - اسے جیسے دل ہی دل میں یقین ہو جاتا کہ اب کوئی دفتری مسئلہ سلجھے بغیر نہیں رہے گا - کوئی انتظامی گرہ ایسی نہیں تھی جسے سلیم کی ماہر اور سلیقہ مند انگلیاں چھو لیں اور وہ کھل نہ جائے -

ونود — جو سلیم کی ساتھ والی میز پر بیٹھتا تھا کبھی کبھار اسے آفس میں داخل ہوتا دیکھ کر آپ ہی آپ شرمندہ سا ہو جاتا - اس دن یا تو ونود کا شیو بڑھا ہوا ہوتا یا اس کی قمیص میلی ہوتی - وہ اس سلسلے میں نہ تو سلیم سے مصروفیت کا بہانہ بنا سکتا تھا — نہ پریشانی کا رونا رو سکتا تھا ، اس لیے کہ وہ سلیم کا سب سے قریبی دوست تھا - وہ جانتا تھا کہ سلیم بھی اس سے کم پریشان نہیں ہے - لیکن اسے پتہ تھا کہ آندھی آئے یا طوفان - گھر پہنچے پہنچے چاہے رات کے بارہ بج جائیں لیکن سلیم اپنے کپڑے قریب والے نل پر ضرور دھوئے گا - ونود کے علاوہ بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ اس کے پاس صرف تین پتلونیں اور دو قمیصیں ہیں - لیکن جب بھی سلیم کو یہ محسوس ہوتا کہ کوئی اس کی سلیقہ مندی کی تعریف کے موڈ میں ہے تو وہ اسے یہ احساس دلوائے بغیر نہ رہتا کہ اس کی زندگی کا سارا سکون ، سارا امن اس کی بیوی کی وجہ سے ہے جو اسے ٹوٹ کر چاہتی ہے - اور یہ ایک حقیقت تھی کہ ریحانہ نے اپنا سب کچھ اس کے لیے تج دیا تھا - اس کی اور سلیم کی پُر امن گھریلو زندگی میں گزشتہ نو برسوں میں فلموں جیسا کوئی موڑ نہیں آیا تھا — معاشی مشکلات کو اس نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی - اور اس چھوٹے سے گھرانے پر جس کے صرف تین افراد تھے — سلیم ، اس کی بیوی اور بچی — باشعور جذبات کی حکمرانی تھی !!

دوسرے دن صبح جب حسب معمول اس کی بچی نے جھک کر اس کے کان میں کہا :

" ناشتہ پک گیا - "

تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھر بستر کے ابھرے ہوئے کونے کو دیکھ کر اطمینان کی ایک سانس لی اور جب تھوڑی دیر بعد ناشتہ لیے اس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی تو وہ سگریٹ کا ٹن سامنے رکھے بستر پر اکڑوں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا — اس نے ریحانہ کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا -

" یہ ڈبہ اب کافی بھر چکا ہے - میں نے ونود سے بات کی ہے وہ مجھے آج پانچ روپے لا دے گا - میں سوچ رہا ہوں اب اس ڈبے کو کھول ڈالنا چاہیئے - "

اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ایک بڑی کیل سے ڈبے کے ڈھکنے کو چیر دیا — اٹھنیاں ، چونیاں اور دس دس نئے پیسے کے کچھ سکے جملہ دس روپے اور چالیس نئے پیسے برآمد ہوئے جنھیں دونوں میاں بیوی نے بار بار گنا — ریحانہ کے چہرے پر اداسی سی آ گئی جسے بھانپ کر سلیم نے جلدی سے کہا :

" بات یہ ری — گھبرا گئیں — میں نے کل ہی داس کی دوکان پر ایک کالا کمبل دیکھا ہے - قیمت صرف تیرہ روپیہ - لیکن خوب گرم ، اتنا کہ اس کا مقابلہ تمہارا وہ بلینکٹ بھی نہیں کر سکتا جو گزشتہ سال ٹرین میں کھو گیا تھا - "

پھر اسے لمحہ بھر کے لیے اپنا وہ خوب صورت اٹالین بلینکٹ یاد آ گیا جو اس کے پاس اچھے دنوں کی یادگار کے طور پر گزشتہ سال تک محفوظ تھا لیکن بُرا ہو بلا ٹکٹ گھومنے والے چوروں کا کہ وہ اس کا عزیز ترین بلینکٹ اٹھا کر لے گئے - پھر اس نے اس تلخ یاد کو جھٹک دیا - اور نئے کھردرے کمبل کے تصور میں کھو گیا -

اور پھر جب وہ رات کو گھر لوٹا تو گیارہ بج چکے تھے اور اس کے

ہاتھ میں اخبار میں لپٹا ہوا ایک بڑا پارسل تھا۔ ریحانہ جاگ رہی تھی اور آج اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس نے جھپٹ کر سلیم کے ہاتھ سے پارسل چھیننا چاہا لیکن سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

" ٹھہرو۔"

اس نے کہا۔

" پہلے کھانا کھائیں۔"

کھانا کھاتے ہوئے ہاتھ روک کر اس نے کہا۔

" ریحانہ — اخبار تو پڑھا ہے نا تم نے "؟

" ہاں — پڑوس سے منگوالیا تھا۔" ریحانہ نے جواب دیا۔

" تھوڑا سا پانی تو دو۔"

اس نے پھر تھوڑی دیر بعد کہا۔ اور جب ریحانہ گلاس میں پانی انڈیل رہی تھی تو بولا :

" سنا ہے ہمارے سپاہی جس علاقہ میں دشمن کا سامنا کر رہے ہیں، وہاں آنسو تک جم جاتے ہیں۔"

" سچ ۔"

سلیم نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

" ہاں — اتنی سردی جتنی ہمارے پاس ہو رہی ہے نا — اتنی تو اس علاقے میں ان دنوں میں ہوتی ہے جب یہاں ہم آنگن میں آسمان کے نیچے پیر پھیلا کر سوتے ہیں۔

" اوہ !"

ریحانہ کی آواز میں حیرانی اور بڑھ گئی تھی۔

پھر تھوڑی دیر دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ کبھی کبھی ریحانہ چور نظروں سے اس بڑے پارسل کی طرف دیکھ لیتی تھی جو سلیم نے اپنے گھٹنوں کے نیچے دبا رکھا تھا۔

کمرے میں آنے کے بعد سلیم کا سوتی گلوبند پتہ نہیں کب ریحانہ کے کانوں پر پہونچ گیا تھا۔ گلوبند میں اس طرح لپٹی ہوئی ریحانہ اسے کبھی کبھی گڑیا سی لگتی تھی — کپڑے کی بنی ہوئی — گول مٹول گڑیا — وہ خوب صورت تو نہیں تھی لیکن اس نے ایک دن ریحانہ سے کہا تھا :

" مجھے یقین ہے کہ اگر تم منھ دھونے کے بعد نتھرے ہوئے پانی کو سکھاؤ تو یقیناً عرقانونی طور پر نمک بنا سکتی ہو۔"

اور یہ بات جھوٹ بھی نہیں تھی۔ اس کے خدوخال انتہائی سیدھے سادے تھے لیکن قدرت نے ملاحت کے سلسلے میں اس کے ساتھ انصاف کیا تھا۔

" بلینکٹ بارہ روپیہ ہی میں مل گیا۔"

سلیم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" سچ " ریحانہ نے خوش ہو کے پوچھا اور پھر صبر نہ کر سکی اور جھپٹ کر پارسل کھول دیا — لیکن پارسل میں بلینکٹ کی بجائے ایک پرانی موٹی سی چادر تھی۔

ریحانہ کا دل دھک سے رہ گیا

سلیم نے اسے اٹھ کر سینے سے لگالیا۔

" بلینکٹ میں نے سپاہیوں کے لیے دے دیا ہے — سرحد پر سردی کی آج جو خبریں ملی ہیں انھیں پڑھ کے میں رہ نہیں سکا۔

ریحانہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔

" روحی ۔" سلیم نے سرگوشی کی۔ " شکر کرو۔ یہاں آنسو تو نہیں جمتے۔"

معذرت

شری نریندر لوتھر کی کہانی "میں ہوں" (شائع شدہ آج کل ۴ ۱۹۶ء) کے بعض حصے غلطی سے کتابت سے رہ گئے جس کا ہمیں افسوس ہے (ادارہ)

محمد امین

زہرہ کا سفر مے ریز دوم کی روشنی میں

امریکی سائنس داں رات بھر کام کرتے رہے۔ وہ تھک کر چور ہو گیے تھے۔ لیکن جب وہ اپنی تجربہ گاہ سے گھر جا رہے تھے تو تکان کے باوجود وہ جانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی نظریں بار بار آسمان کی طرف اٹھتیں اور صبح صادق کو دیکھتیں۔ مشرق کی طرف سے سویرے سویرے زہرہ نکلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

اس دن ۱۴- دسمبر ۱۹۶۲ء کی تاریخ تھی۔ صبح ہی صبح اس سیارہ کا نظر آنا خصوصی کشش کا باعث تھا۔ کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے سائنس دان زہرہ کی اہمیت کو جانتے تھے۔ اس کا فاصلہ زمین سے ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ میل ہے۔ خلا میں جانے والا ایک جہاز مے ریز دوم پہلے ہی سے زہرہ کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اس راکٹ میں الکٹرانک کی دو آنکھیں لگی ہوئی تھیں جو کبھی جھپک نہیں سکتی تھیں۔ ان کی مدد سے سائنس دان دور دراز کے سیارہ کو دیکھیں گے۔

زہرہ دلچسپ سیارہ ہے اور زمانۂ قدیم سے خیالات اور تخیلات کا مرکز رہا ہے۔ یہ صبح کے وقت تارے کی مانند چمکتا ہے۔ کیا اس سیارے میں زندگی کے آثار ہیں؟ کیا اس میں جنگلات ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے درخت حرکت کرتے ہیں اور وہ باہوش ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا سیارہ ہو جو بالکل اجاڑ ہو اور وہاں گرد و غبار کی موٹی تہ بیٹھی ہوئی ہو۔

راکٹ سے جب پہلی خبریں آئیں وہ ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں کے لیے ہمت شکن تھیں۔ مے ریز کے تیز اور حساس آلوں کی مدد سے یہ معلوم ہوا کہ زہرہ بہت گرم، خشک اور بالکل اجاڑ ہے۔ زندگی کے کوئی آثار نہیں ہیں اور اگر کچھ ہیں بھی تو ایسے ہیں کہ وہ ٹھنڈے بادلوں کی تہوں میں بہت ہی باریک اور مہین حالت میں پنہاں ہیں۔

چند سال پہلے بھلا کون شخص زہرہ تک پہنچنے کا خواب دیکھ سکتا تھا۔ اڑان کے لیے نہ صرف خلاء کا ماہر ہونا ضروری ہے بلکہ ایک زبردست میکانکی اور انتہائی ہوشیار قسم کا جانور بن کر اپنے فرائض انجام دینا ہے جو کہ مہینوں کرۂ ہوائی سے بہت دور اور بلندی پر رہ کر مخالف ماحول کا نہایت کامیابی سے مقابلہ کر سکے۔ اسے حکم ماننے کے لیے بھی تیار رہنا ہوگا جو کہ لاکھوں میل نیچے زمین سے نافذ کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ریڈیو کی بہت باریک ٹکنیک کی ضرورت پڑے گی۔ اپنا راستہ خلاء میں قائم رکھنے کے لیے بھاری بھاری کمپیوٹرس (حساب کتاب لگانے کی مشینیں) استعمال کرنے پڑیں گے۔ خلاء کے جہاز میں ایک بڑا کمرہ بھی فٹ کرنا پڑے گا جس کے اندر خلاباز آرام سے رہ سکے۔

جو لوگ خلا کے جہاز میں جائیں گے ان کی زندگی بالکل نئے انداز کی ہوگی جیسے کہ آج سے کروڑوں سال پہلے ان جانوروں کی حالت تھی جو پہلی بار سمندر سے ہمت کر کے خشکی پر آئے تھے اور رفتہ رفتہ روشنی اور ہوا میں رہنے کا ڈھنگ سیکھ گئے تھے۔

امریکہ کی تاریخ میں ۱۹۳۶ء میں ایک اہم واقعہ پیش آیا تھا۔ دراصل وہ قدم مے ریز کی کامیاب اڑان کا پیش خیمہ تھا۔

کچھ طلبا اور چند سائنس دانوں نے کیلی فورنیا (امریکہ کی ایک ریاست)
میں پہاڑوں کے پیچھے ایک الگ تھلگ تنہائی کی جگہ ڈھونڈھی تھی
اور پھر اس جگہ سے اپنا پہلا ابتدائی راکٹ اڑایا تھا۔ دوسری
جنگ عظیم شروع ہونے تک ان لوگوں نے اپنا جوش اور کام کا
حوصلہ باقی رکھا۔ اس کے بعد امریکہ کی سائنس کی قومی اکیڈمی نے
تھیوڈور وان کارمن کو بہ حیثیت ایک ماہر کے مقرر کیا۔ ساتھ ساتھ
دس ہزار ڈالر منظور کیے تاکہ مسٹر کارمن جٹ بنانے کی تجربہ گاہ
قائم کریں۔ یہ تجربہ گاہ بہت بڑھ چکی ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ
کام کر رہی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ چاند اور اس کے بعد
خلا کے اندرونی حالات کا جائزہ لیا جائے اور انسان کو خلا میں بھیجنے
سے پہلے اس کی معلومات فراہم کی جائیں۔

جٹ بنانے کی تجربہ گاہ میں کئی ایک ناکامیاں بھی ہوئی ہیں۔
رینجر کی قسم کے پانچ منزلہ راکٹ جتنے بھی بنائے گئے وہ سب محض ناکام
ثابت ہوئے لیکن پھر بھی چاند کی سطح کا حال دریافت کرنے کے لیے
جو بھی رینجر اڑایا جاتا تھا اس میں آلے فٹ رہتے تھے اور وہ حالات
بتاتے تھے۔ اس طرح تجربے سے سائنس دانوں نے بہت کچھ سیکھا
اور ان کے پاس اچھا خاصا مواد تیار ہو گیا۔ اب ان کو یہ معلوم تھا کہ کیا
کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ اکسپلورر اول جو ۳۱ جنوری
۱۹۵۸ء کو جٹ تجربہ گاہ سے اڑایا گیا تھا۔ وہ ابھی تک چکر لگا رہا
ہے اور یہ سب سے پرانا امریکی سفیر ہے۔

اسی دوران میں جٹ پروپلشن لیبوریٹری سے ریز بنانے
کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ زہرہ کی تحقیق کی جائے۔
سامنے بڑی دقتیں تھیں۔ سیال ہائڈروجن سے چلنے والا سن ٹور
نام کا راکٹ جس کی مدد سے ۱۰۵۰ پونڈ خلا کے جہاز کو ۱۹۶۲ء میں
اڑانا تھا۔ وہ کام ابھی بہت پیچھے تھا۔ اب ایک فیصلہ کرنا ضروری
تھا۔ زہرہ کا پروجکٹ کیا غیر معین مدت کے لیے ملتوی کر دیا جائے یا
مے ریز کا ڈیزائن پھر سے تیار کیا جائے اور وہ اس قدر ہلکا ہو کہ
اسے اٹلس راکٹ سے اڑایا جا سکے۔ مے ریز کے وزن کو گھٹا کر
۴۴۷ پونڈ کرنا ہوگا لیکن خطرہ یہ تھا کہ ہلکا ہونے سے نقصان یہ
ہوگا کہ زہرہ کی چھان بین کرنے والے کئی آلوں کو خیرباد کہنا پڑے گا۔

قومی اکیڈمی کے لیے یہ اہم فیصلہ کا وقت تھا۔ لیبوریٹری کے
ڈائرکٹر نیوزی لینڈ کے ولیم ہے ورڈ پیکرنگ تھے اور جو الکٹرانک
آرٹ کے ماہر تھے، خاص طور سے لمبی مسافت اور اس کی پیمائش کرنے
میں۔ ڈائرکٹر پیکرنگ نے کئی جلسے کیے۔ سب سے رائے لی۔ آخرکار یہ
فیصلہ ہوا کہ ہلکا مے ریز استعمال کیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ مے ریز
کو اس وقت اڑایا جائے گا جب کہ زہرہ بہت ہی موافق پوزیشن میں
ہوگا۔ ایسا موقع ۱۹ مہینے میں ایک بار آتا ہے۔ ۱۹۶۲ء کے درمیانی
حصہ میں اس کا موقع تھا۔ فیصلے کے بعد ابھی نو مہینے باقی تھے۔ پیکرنگ
نے خود ایک کہاوت دہراتے ہوئے کہا "کہ کوئی بھی پروجیکٹ ہو اسے
مکمل کرنے میں نو مہینے سے کم نہیں لگتے۔"

جون میں تاریخ متعین کر دی گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس وقت
تک کیپ کارنوال میں مے ریز نام کے دو خلا کے جہاز تیار کر دئے
جائیں گے۔ اب ہر ایک کو دھن تھی۔ تجربہ گاہ میں دن رات کام کیا
جانے لگا۔ ڈیزائن بنانے والے نے پنجر کے ڈھانچے سے کام شروع
کیا۔ اس میں کچھ نئے آلے فٹ کئے گئے جو کہ زہرہ کی لمبی اڑان کے لیے
ضروری تھے۔ مشاہدہ کرنے والے آلے بھی، جتنی گنجائش تھی اس کے
مطابق اس کے اندر بھر دئے گیے۔ ہر حصہ کو آزما کر دیکھا گیا۔ خوب خوب
تجربے کیے گئے۔ آخرکار مے ریز ایک عجیب اور نہایت خوبصورت
راکٹ بن گیا۔ اس کے ہلکے ڈھانچے پر المونیم کی پالش کر کے اسے چمکا دیا
گیا۔ میگنیشیم کے جو حصے بنے تھے اسے سنہری پالش سے ملمع کر کے
صاف کر دیا گیا۔ دھوپ اور حدت جذب کرنے کے جو پنکھے تھے
وہ سرخ کر دیئے گئے۔ جیسے کہ ایک بڑی تتلی کے پر ہوں۔ اس کے
سنہرے چھ طرفہ پیڑو میں الکٹرانک کے اعضا، دماغ اور دوسرا
سامان رکھ دئے گئے اور ان کو نہایت مضبوطی کے ساتھ باریک
تاروں سے جوڑ دیا گیا۔

مے ریز دیکھنے میں نہایت گول سڈول معلوم ہوتا تھا اور
خلا کے اندر اڑانے کے لیے نہایت موزوں تھا۔ لیکن جب اسے مروڑ
کر اڑانے سے پہلے بوسٹر راکٹ کی ناک میں فٹ کیا گیا تو اس وقت

محسوس ہوا کہ اگر غلطی سے اس میں نقص باقی رہ گیا تو اس کی وجہ سے یہ انسان کے رسیلے اور نرم جسم کو کچل کر پیس سکتا ہے۔

۲۲-جولائی ۱۹۶۲ء کو زہرہ ٹھیک پوزیشن میں آگیا۔ مے رینر نمبر ایک کیپ کارنوال سے اڑایا گیا۔ راکٹ کی اڑان ٹھیک تھی اور تھوڑی دیر تک اطلس ٹھیک طرح پرواز کرتا رہا۔ پھر اس میں کچھ جنبش آنے لگی اور یہ کچھ منڈلانے لگا گویا کہ ایک پھنسی ہوئی بھاری مچھلی کانٹے سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہو۔

کارنوال کے سب افسران پریشان تھے یہاں تک کہ جو افسر مے رینر کو محفوظ رکھنے کا ذمہ دار تھا اس نے 'تباہ' کرنے والا بٹن دبا دیا۔ منٹوں میں شعلے نکلنے لگے اور مے رینر دھوئیں میں گھر گیا۔

اس پروجیکٹ کے منیجر جیک جیمس نے کہا۔ "اس خطرہ سے تباہ ہوتے ہوتے ہم بال بال بچے۔ واقعتاً ہمیں بڑی فکر تھی لیکن جلد ہی مے رینر دوم کے بارے میں ہم نے سوچنا شروع کر دیا۔ ہماری کامیابی کا دارومدار اب اسی پر تھا۔" سبھی لوگ فکرمند اور مایوس تھے لیکن کام کرنے والوں کا ذہن پھر آمادہ ہو گیا۔ زندگی کی لہر از سرِ نو واپس آگئی۔

مے رینر دوم جلد ہی بن کر تیار ہو گیا اور ۲۷۔ اگست کو پرواز کے لیے پلیٹ فارم پر آگیا۔ زہرہ کی پوزیشن اب بھی غنیمت تھی۔ اس دفعہ پرواز کامیاب ثابت ہوئی۔ ایجینا پھر اپنے مدار پر روانہ ہو گیا۔ سولہ منٹ کے بعد دوسرے انجن نے کام کرنا شروع کر دیا اور پھر مے رینر زہرہ کی طرف بل کھاتا ہوا چل پڑا۔ چند منٹ کے بعد پنکھوں کے چمکنے کی جھلک آئی اور پھر خلا کے جہاز نے دھوپ جذب کرنے کے لئے اپنے دونوں پر پھیلا دئے۔ چند سیکنڈ میں بجلی کی لہر دوڑ گئی اور اس کے عضو عضو میں حرارت آگئی۔ مے رینر دوم اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں بڑھتا جا رہا تھا۔

پیکرنگ اور ان کے سائنس دانوں کی پوری ٹیم مسلسل اس کا مشاہدہ کرتی رہی گویا کہ مے رینر دوم ان کی اولاد ہے اور وہ لوگ اس کے والدین۔ اس کی کامیابی کی ان کو بڑی فکر تھی۔ غلطی ہونے کا اب بھی خطرہ تھا۔ کرۂ ہوائی میں جو حالات ٹھیک حالت میں تھی

وہ خلا کے اندر جا کر کیا پتہ کہ دھوکا نہ دے جائے۔ دوسری خطرے کی چیز حرارت تھی۔ خلا کے اندر ویسے درجۂ حرارت نہیں ہے لیکن جو بھی چیز خلا میں جاتی ہے وہ گرم ہونے لگتی ہے۔ اس کا دارومدار اس توازن پر ہے کہ وہ خود اپنے آپ کتنی گرمی جذب کرتی ہے اور پھر کتنی گرمی خارج کرتی ہے۔ اگر کوئی چیز رنگ دی جائے تو خلا کے اندر اس کا ایک طرف کا حصہ ٹھنڈا اور دوسری طرف کا حصہ گرم رہے گا۔ اسی طرح ایک چمکیلی چیز کی بھی حالت ہو سکتی ہے۔ خلا کے جہاز کے ہر حصہ کو خاص درجہ حرارت کے مطابق قایم رکھنا ایک مشکل کام ہے۔

خلا کے جہاز میں دو ریڈیو میٹر لگے ہوئے تھے۔ ایک مائکرو ویوز (لہریں) کے لیے اور دوسرا انفرارڈ کرنوں کے لیے۔ ریڈیشن (شعاع افشانی) جب بادلوں یا گیسوں میں سے ہو کر گزرتا ہے تو وہ مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد کچھ ایسی فری کوئنسی رکھی گئی تھی کہ وہ زہرہ کا درجۂ حرارت اور اس کی فضا کی حقیقت زیادہ سے زیادہ ظاہر کریں اور وہاں کے حالات برابر نشر کرتے رہیں۔

مے رینر دوم اپنی آخری منزل پر جب پہنچا تو وہ زہرہ سے ۲۱۰۰۰ میل دور تھا۔ لیکن اگر اس کے اندر کوئی خلا باز بیٹھا ہوتا تو وہ ایک بہت بڑا اور حیرت انگیز منظر دیکھتا۔ زہرہ زمین کے مقابلے میں سورج کے زیادہ قریب ہے اور اس کے اندر عکس پھینکنے کی طاقت بھی زیادہ ہے اس لئے وہ بہت تیز چمکتا ہے۔ کوئی چاند اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شروع میں مے رینر دوم سے ہلال کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ قریب پہنچنے سے اس کی سائز بڑھتی گئی اور آخر میں یہ اس قدر روشن ہو گیا کہ اگر کوئی خلا باز دیکھتا تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں اور وہ مکمل چاند سے ۵۰ گنا زیادہ بڑا دکھائی دیتا خاص طور سے اس کا قطر۔ روشنی کے لحاظ سے یہ چاند سے ۱۳۰۰۰ گنا زیادہ تیز چمکتا ہے۔

مے رینر ساری اطلاعات نشر کرتا رہا۔ جنوبی افریقہ میں جوہنس برگ، آسٹریلیا میں او میرا اور کیلی فورنیا میں گولڈ اسٹون

ان تینوں جگہوں کی ریڈیو کی بھاری ڈور بینوں نے رپورٹ ریکارڈ کیں۔ ریڈیو سگنل اور دوسری خفیہ خبروں کو کمپیوٹر (حساب لگانے کی مشین) کی مدد سے پڑھا گیا۔ جٹ پروپلشن لیبوریٹری کے سائنس دانوں نے تفصیلات معلوم کیں اور اپنے خلا کے جہاز کی آواز کو اچھی طرح سمجھا اور ان سے معنی مطلب اخذ کر لیا۔ فروری ۱۹۶۳ء میں نتائج معلوم ہو گئے اور پھر ان کا اعلان باقاعدہ کر دیا گیا۔

بہرحال سے ریز میں جو آلے فٹ تھے انھوں نے زہرہ کو تین مرتبہ ریکارڈ کیا۔ سب سے پہلے جو اس کا تاریک حصہ تھا اس کی تفصیل ریکارڈ کی۔ پھر روشنی اور تاریکی کے سرحد کی تصویر لی اور آخر میں اس کے روشن حصہ کی تصویر کھینچی۔

مائیکرو ویو کے ریڈیو میٹر نے جو رپورٹ بھیجی اس سے پتہ چلا کہ زہرہ کی سطح کا درجۂ حرارت ۴۲۵ ڈگری سنٹی گریڈ (۸۰۰ ڈگری فارن ہائٹ) ہے اور یہ درجہ حرارت اس کے تاریک اور روشن دونوں حصوں میں ہے۔ یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہاں پانی کے قطرے یا بھاپ بھی ہے یا نہیں۔

علم طبیعات کے ماہر نیوا دا یونی ورسٹی کے یوس کیسلان اور جٹ پروپلشن لیبورٹری کے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زہرہ کی فضا کا درجۂ حرارت زمین کی فضا کے درجۂ حرارت سے ۲۰ گنا زیادہ ہے۔ خشکی بھی بہت ہے اور اس میں سانس لینا ناممکن ہے۔ اس میں کاربن ڈائی آکسائڈ دس فی صدی ہے (زمین کی فضا میں ۰۳ء۰ فی صدی ہے)، تھوڑی سی نائٹروجن بھی ہے۔ انفرارڈ کی لہروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زہرہ کے بادل کبھی چھٹتے ہی نہیں اور وہ اس قدر گہرے ہیں کہ نیچے کی ہر چیز تاریک ہے۔ راڈر کی لہریں جو زہرہ کی ٹکر سے صدائے بازگشت پیدا کرتی ہوئی آتی ہیں اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں پہاڑ اور میدان یا دریاؤں کی وادیاں دونوں ہیں۔

زہرہ کے بادل بڑے عجیب ہیں اور ان کا راز کسی کو نہیں معلوم ہو سکا ہے۔ پروفیسر کالپن کا خیال ہے کہ وہ ہائیڈرو کاربن ڈرا پلیٹ سے مل کر بنے ہیں۔ یہ قطرے بالائی فضا میں ٹھنڈک کی وجہ سے جم جاتے ہیں لیکن نیچے کی فضا میں نمی کی حالت میں برقرار رہتے ہیں اور وہاں پر درجۂ حرارت ۹۵ ڈگری سنٹی گریڈ (۲۰۰ ڈگری فارن ہائٹ) سے زیادہ رہتا ہے۔

سورج سے انفرارڈ شعاعیں جو آتی ہیں وہ بادل اور کرۂ ہوائی دونوں میں سے گھس کر نیچے پہنچ جاتی ہیں۔ لیکن پھر جب وہ واپس آنے کی کوشش کرتی ہیں تو فضا کا غلاف ان کو روک دیتا ہے۔ سورج کی گرمی اور حدّت اس طرح مقید ہو جاتی ہے اس کی وجہ سے زہرہ کی سطح بہت گرم رہتی ہے۔ اس قدر گرم کہ اس ماحول میں زمین کی کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔

ریڈیو کی ڈور بین سے یہ پتہ چلا ہے کہ زہرہ اپنی کیلی پر آکر گھومتا بھی ہے تو اس کی رفتار بہت سست ہے۔ اپنے مدار پر گھومتے وقت یہ اپنی کیلی پر نہیں گھومتا اور اس طرح اس کا دن سال کے برابر ہے (زمین کے ۲۲۵ دنوں کے برابر) یا یہ کہ یہ اتنی آہستہ آہستہ گھومتا ہے کہ اس کا صرف ایک ہی حصہ ہمیشہ سورج کی طرف رہتا ہے جیسے کہ عطارد کا قصہ ہے۔

بہرحال دونوں صورتوں میں سے ریز دوم کی یہ خبر کہ اس سیارہ کا ہر حصہ ایک ہی درجہ حرارت کا متحمل ہے بڑا دلچسپ انکشاف ہے۔ اس کی وجہ سے اس سیارے کے متعلق یہاں اور دنیا کے سائنس دانوں کو از سرِ نو غور کرنا پڑے گا۔ جب یہاں رات ہوتی ہوگی تو غالباً بڑی طویل رات، بلکہ نہ ختم ہونے والی رات ہوتی ہوگی اور اس کے تاریک حصے کو ٹھنڈا ہو جانا چاہیئے۔ لیکن یہ گرم کیوں رہتا ہے؟ اس سلسلے میں ڈاکٹر کاپلن کا جواب یہ ہے کہ چونکہ اس سیارے کا کرۂ ہوائی موٹا اور گہرا ہے اور ہوائیں ہلکی چلتی ہیں اس لیے اس کے تاریک سطح کی گرمی باقی رہتی ہے۔ دراصل ہائیڈرو کاربن کے بادل ۱۵ میل موٹے ہیں اس لیے سطح کی گرمی نکل کر بھاگنے نہیں پاتی۔

سائنس داں جب کہ زہرہ کی خبروں کی چھان بین کر رہے ہیں جٹ پروپلشن لیبوریٹری اس دوران میں زمین سے باہر نکل کر اوپر کی دنیا کی مزید خبریں لانے کی کوشش کر رہی ہے۔ سیارے کی تحقیق کے لیے دوسری کوشش ۱۹۶۴ میں کی جائے گی جب کہ ایک راکٹ مریخ کی طرف بھیجا جائے گا۔ اسی سال یعنی ۱۹۶۴ء میں چاند کی بھی مزید جانچ کی جائے گی۔ خلا کی تحقیق کرنے والے ماہرین چاند کی سطح کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں گے کہ آیا اس پر بڑے جہاز اتر سکتے ہیں یا نہیں تاکہ بعد میں انسان بآسانی اس پر اُتر سکے۔ پھر وہ اس بات کی جانچ پڑتال کر سکے کہ چاند کی سطح آیا سخت چٹانوں کی بنی ہے یا گرد و غبار کی اور پھر اس میں ریڈیو ایکٹو مادے تو نہیں شامل ہیں؟ بہرحال خلا کا جہاز جب چاند اُتر جائے گا تو اس سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کے بعد مریخ پھر بعد میں مشتری پر اُترے گا۔

انسان کبھی قانع نہیں ہو سکتا۔ یہ مسلسل جد و جہد کرے گا اور خلا میں اپنی فوقیت قائم کیے بغیر دم نہیں لے گا۔

مشیر جھنجھانوی

غزل

مرا دستِ جنوں کب سلسلہ جنباں نہیں رہتا
رگِ جاں کی طرف بڑھتا ہے جب داماں نہیں رہتا

کسی صورت نہیں رہتا، کسی عنواں نہیں رہتا
تمہارے اک تبسم سے غمِ دوراں نہیں رہتا

ہمارا ناخدا کا چھوڑ کر اک ڈوبنے والا
وہاں پہنچا جہاں اندیشۂ طوفاں نہیں رہتا

حوادث سے پریشاں کیوں ہے آخر اے دلِ غمگیں
نظامِ عالمِ امکاں کبھی یکساں نہیں رہتا

مقید ہوں مگر پیشِ نظر صحرائے دل کش ہے
جنوں کے دور میں زنداں کبھی زنداں نہیں رہتا

مجھے تسکین دی جاتی ہے ذکرِ امنِ ساحل سے
مگر اس وقت جب اندیشۂ طوفاں نہیں رہتا

تمہاری ہر ادائے دل نشیں سے ہو گیا واقف
مرا دل آئینہ ہو کر بھی اب حیراں نہیں رہتا

اگر موتی نہیں ہوتے ہیں کچھ آنسو تو ہوتے ہیں
بفیضِ شدتِ غم میں تہی داماں نہیں رہتا

جنونِ عشق کی شوریدگی کو ہائے کیا کہیے
کسی عنواں لحاظِ عظمتِ داماں نہیں رہتا

تغافل کیشیاں جب لطف کا پہلو بدلتی ہیں
کسی کو یاد پھر افسانۂ حرماں نہیں رہتا

مری آنکھوں سے ڈھل ڈھل کر مرے دامن میں بہتا ہے
محبت میں کوئی آنسو سرِ مژگاں نہیں رہتا

فریبِ شوق سے ناکامیٔ پیہم پہ بھی خوش ہوں
محبت میں مشیر اندازۂ حرماں نہیں رہتا

ع ۔ م
احتشام حسین
ش ۔ ح

نئی کتابیں اور رسالے

طلوعِ سحر

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے کلام کا مجموعہ ۔ نیو تاج آفس پوسٹ بکس ۱۷۴۹ دہلی ۔ ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت پانچ روپے ۔

کتاب فوٹو آفسٹ سے چھپی ہے ۔ جلد اور جلد پوش ، کاغذ طباعت نہایت عمدہ ۔ شاذ ہی اردو میں کوئی ایسی حسین و جمیل کتاب چھپی ہو ۔

سحر صاحب کے اپنے قول کے مطابق ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ شاعری ان کے لیے ذریعۂ عزت نہیں ۔ وہ ایک ممتاز خاندان کے فرد اور پیشے کے لحاظ سے ایک ممتاز حاکم ہیں لیکن اردو شاعروں میں بھی ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں ۔ اس کتاب کے شروع میں ان کی ایک حسین و جمیل تصویر شاملِ کتاب ہے اتنا ہی حسین و جمیل دل ان کے پہلو میں ہے ۔ وہ بڑے نیک اور خوش خلق انسان ہیں اور ان کی یہ خوبیاں ان کے اشعار میں نمایاں ہیں ۔

غزل ان کا میدانِ سخن ہے اور اس میدان کو انھوں نے اپنی قادر الکلامی سے سر کیا ہے ۔ ان کے اشعار میں آمد ہی آمد ہے آورد کا نام نہیں ۔ کیونکہ یہ شعر اسی وقت کہتے ہیں جب شعر اپنے آپ کو کہلواتا ہے ۔ ان کا ذوقِ سخن پاکیزہ ، مصرعوں کی تراش دلآویز اور تراکیب کا حسن فصاحت آمیز ہے ۔ اس کے ساتھ ان کی کاوشیں خیال انگیز ہیں ۔ اندازِ بیان میں ایسی حلاوت ہے کہ ہر شعر بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے ۔

پریشاں تھے تری محفل سے باہر　　پشیماں ہیں تری محفل میں آ کر

سحر جو نیک بندے ہیں خدا کے　　وہ خود پیتے ہیں اوروں کو پلا کر

ان کا یہ مقطع خود ان کی زندگی کا مسلک ہے ، کیونکہ نہ جانے کتنے ادیبوں اور شاعروں کی انھوں نے مدد کی اور کر رہے ہیں ۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

یوں تو ان آنکھوں نے دیکھا ہے بہت کچھ لیکن
اک نظر سوئے جہاں گزراں اور سہی

اپنا قصہ انھیں سو بار سنا رکھا ہے
اب یہ اندازِ حدیثِ دیگراں اور سہی

یوں تو انسان زمانے میں ہیں لاکھوں لیکن
وہی انساں ہے جو انسان کے کام آتا ہے

دل تو مشکل پسند ہے لیکن　　کوئی مشکل نظر نہیں آتی

اپنی وسیع القلبی کے طفیل انھیں شاید محبت میں کبھی مایوسی نہیں ہوئی اسی لیے تو کہہ گئے ؎

ہم نے وہ وقت بھی دیکھا ہے محبت میں کہ جب
کوئی شکوہ نہ رہا تنگیٔ داماں کے سوا

کہاں تک کوئی ان کے اشعار کی داد دے ۔ ان کے یہاں زندگی کی نفسیات ، مے خانے کی ہاؤ ہو ، حسن کے کرم و ستم اور عشق کی جنوں انگیزیاں سب کچھ ہے ۔ امورِ مملکت اور کارِ خسروی انھیں نہیں چھوڑتے ورنہ نہ جانے سحر کا طلوع کتنی بار ہوتا اور اس ایک دیوان کے عوض کتنے ہی دیوان اب تک طبع ہو گئے ہوتے ۔ ہمیں امید ہے کہ یہ ارمغان ملک کے گوشے گوشے میں مقبول ہوگا ۔

شکنتلا

سنسکرت زبان کے شاعرِ لازوال کالی داس کے عدیم المثال ناٹک کا تازہ ترین اردو ترجمہ جناب منوّر لکھنوی نے کیا ہے جسے آدرش کتاب گھر ۲۹-۱۵۲۸ فیض گنج دریا گنج دہلی نے شائع ہے۔ کتابت اور طباعت، جلد اور جلد پوش عمدہ۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۲۲۰۔ قیمت چھ روپے۔

کتاب کے شروع میں نائب صدر جمہوریہ ہند۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے منوّر صاحب کے ترجمے کی داد دی ہے۔ منوّر صاحب بڑے قادر الکلام شاعر اور ماہر مترجم ہیں بھگوت گیتا کمار سمبھو۔ ملراداکشش، دھم پد، گیتانجلی وغیرہ متعدد کتابوں کے تراجم اور ان کی شعری تصانیف اہلِ وطن سے قبولیت کا خراج وصول کر چکی ہیں۔ شکنتلا کالی داس کا وہ شاہکار ہے جسے دیکھ کر شاعر المانوی گیٹے بے اختیار کہہ اٹھا تھا کہ یہ کتاب صحیفۂ لاجواب ہے۔ اب تک اردو زبان میں اس شاہکار کے متعدد ترجمے چھپے ہیں لیکن منوّر صاحب کی یہ کوشش بڑی کامیاب کوشش ہے۔ ترجمے کی نثر، نظم دونوں رواں ہیں اور پڑھنے میں کہیں رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ہم سنسکرت تو نہیں جانتے لیکن مسٹر کالے (Kale) کے انگریزی ترجمے سے اس ترجمے کو ملا کر دیکھا تو منوّر صاحب کے کمال کی داد دینا پڑی۔ دو مثالیں ترجمے کی تیسرے ایکٹ سے پیش کی جاتی ہیں:

Why speak of a (or what need of) Fixing an arrow on (the bow?) For he removes from afar or all obstacles by the mere twang of the bow-string; as if by the angry hum of his bow (I)

تیر ترکش سے ابھی تک ایک بھی نکلا نہیں
پھر بھی کیسا امن کا ماحول پیدا کر دیا
جتنے فتنے تھے کماں کے سامنے سب گرد ہیں
ایک ہی ٹنکار سے سب کا صفایا کر دیا

I am aware of the potency of penance it is (also) known to me that the maiden is another's power.

بڑی ہے اس کی عظمت مانتا ہوں
کہ میں تاثیرِ تپ کی جانتا ہوں
نہیں آنے کی میری دسترس میں
کہ ہے یہ نازنیں اوروں کے بس میں

جہاں سے بھی آپ دیکھئے ترجمہ بڑی وفاداری سے کیا گیا ہے اور خوبی یہ ہے کہ روانی میں کہیں فرق نہیں آیا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ ترجمہ مقبول ہوگا۔ (ع۔م)

کالی داس قیمت دو روپے۔ تلسی داس قیمت دو روپیہ پچاس نئے پیسے۔ از مسٹر جے کرشن چودھری۔ ناشر رائے صاحب رام دیال اگروال الہ آباد۔

گزشتہ پچیس سالوں میں جے کرشن چودھری صاحب نے سنسکرت اور ہندی ادب کے مشاہیر کو اردو دان طبقہ سے روشناس کرانے کی جو کوشش کی ہے وہ لائقِ صد تحسین ہے۔ یہ کام صرف علمی حیثیت سے اہم نہیں ہے موجودہ حالات میں اس کی تہذیبی اور سماجی حیثیت بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب دنیا کی بین الاقوامی زبان ہے۔ زبانوں کے فرق کے باوجود خیالات، جذبات اعلیٰ شاعرانہ طرزِ اظہار، بلند اخلاقی نصب العین کے اشتراک کی وجہ سے ادب اور شعر لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں۔ اس لحاظ سے کالیداس اور تلسی داس کی شاعرانہ عظمت سے واقفیت ہر تعلیم یافتہ انسان کے لیے لازم ہے۔ بدقسمتی سے اس بات کی کوشش ہندوستان میں کبھی نہیں کی گئی کہ لوگ کئی کئی زبانیں سیکھیں اور ترجموں کا کام بڑے پیمانے پر ہو۔ جن لوگوں نے کچھ ترجمے کئے بھی ان میں وہ شاعرانہ اور ادبی خصوصیات نہ پیدا ہو سکیں جو اصل میں پائی جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر دوسری زبانوں کے اعلیٰ شاعروں سے تعارفی واقفیت بھی ہو جائے تو بڑی چیز ہے۔ میں اس نقطۂ نظر سے جے کرشن چودھری صاحب کے کارناموں کو اہم سمجھتا ہوں۔

اس وقت میرے سامنے ان کی دو کتابیں کالی داس اور تلسی داس ہیں جو ہمیں دو عظیم المرتبت شاعروں سے روشناس کراتی ہیں۔ کالیداس سنسکرت کا مہرِ منوّر ہے اور تلسی داس ہندی کا خورشیدِ تاباں۔ ہندوستانی زندگی فلسفہ، کردار، مزاج، اخلاقی تصوّرات، نظریۂ حیات کے سمجھنے کے لیے

ان کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ دونوں شاعروں نے ہندو فلسفہ، وید، ویدانتوں، اپنشدوں اور شاستروں کا رس نچوڑ کر اپنی شاعری میں پیش کر دیا ہے۔ چودھری صاحب نے اپنی دونوں کتابوں میں اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ ان دونوں شاعروں کے سوانح حیات اور ادبی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان کے نظریۂ حیات کی طرف بھی متوجہ کریں۔ کالی داس کے جو اور ترجمے دستیاب ہیں انھوں نے ان سے بھی مدد کی ہے اور بعض خیالات کے پیش کرنے میں ان مغربی علماء کے افکار و خیالات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے جو ان کی دسترس میں تھے۔ اس طرح تلسی داس کے متعلق جتنا مواد ہندی اور انگریزی میں موجود تھا انھیں کھنگال کر انھوں نے تلسی داس کی مختلف سوانح عمری پیش کر دی ہے۔ ساتھ ہی ان کے شاعرانہ کمالات اور اخلاقی تصوّرات پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

اگرچہ ان دونوں کتابوں کی حیثیت تعارفی ہے لیکن مصنّف نے وہ ساری ضروری معلومات یکجا کر دی ہیں، عام مطالعہ کے لیے جن کے جاننے کی ضرورت ہے۔ چودھری صاحب کی زبان سادہ اور انداز بیان دلچسپ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتابیں مقبول ہوں گی اور اردو دانوں میں سنسکرت اور ہندی ادب کے اعلیٰ کارناموں سے واقفیت کا ذوق پیدا کریں گی۔

(پروفیسر سید احتشام حسین)

فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ

سیّد ضمیر حسین دہلوی۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقّیٔ اردو ہند (دہلی) مجلد مع گرد پوش، لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

زیر نظر کتاب ۸ مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلے دو مضامین کے سوا باقی تمام مضامین فسانۂ عجائب سے متعلق ہیں۔ سرور کی یہ تصنیف بلاشبہ ہمارے کلاسیکی ادب میں شمار ہوتی ہے لیکن اسے وہ قبولِ عام نہ ہو سکا جس کی یہ مستحق تھی۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ اس اہم تصنیف کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے اور اس کی ادبی قدر متعین کی جائے۔ سیّد ضمیر حسین نے مختلف پہلوؤں سے اس کا جائزہ لے کر ایک مفید کام انجام دیا ہے۔

امید ہے کہ فسانۂ عجائب سے متعلق یہ اچھی کتاب ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی جائے گی۔

وویکانند

مصنف رومین رولاں۔ مترجم پروفیسر سیّد احتشام حسین

سوامی وویکانند کی یہ سوانح عمری مشہور فرانسیسی ادیب رومیں رولاں کی دو تصنیفات 'لائف آف رام کرشن' اور 'لائف آف وویکانند' کے آدھار پر تیار کی گئی ہے۔

سوامی وویکانند نئے ہندوستان کے معماروں میں سے تھے جس نے اپنے اہلِ وطن کو روحانی، اخلاقی اور ذہنی غفلت سے بیدار کیا۔ ان کا پیغام آفاقی ہے۔ یہ ایک عظیم انسان کی کہانی ہے جو ایک عظیم المرتبت صاحب قلم نے لکھی ہے۔

مصنّف ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔ "جب مجلسِ مذاہب کے اس جلسے میں جو شکاگو میں ۱۸۹۳ء میں ہوا تھا، یہ تیس سال کا گمنام نوجوان شریک ہوا تو اس کے پُر شوکت وجود کے سامنے دوسرے تمام لوگ ماند پڑ گئے...... اس کی گہری آواز کی شان دار موسیقی نے امریکی اینگلو سکسنوں کے اس زبردست مجمع کو مسحور کر لیا۔ ہندوستان کے اس سورما پیغامبر کے خیالات نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ پر گہرا اثر ڈالا۔"

اس بات کی ضرورت تھی کہ شری رام کرشن پرم ہنس اور سوامی وویکانند کی تعلیمات سے جس نے ہندوستانیوں پر گہرا اثر ڈالا ہے، اردو داں طبقہ بھی واقف ہو۔ سوامی وویکانند کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر اس کتاب کو شائع کر کے ساہتیہ اکادمی نے ایک مستحسن قدم اٹھایا ہے۔

انگریزی سے ترجمہ مشہور ناقد پروفیسر احتشام حسین نے کیا ہے جو بڑا ہی رواں اور شگفتہ ہے۔

کتابت، طباعت اچھی ہے۔ صفحات ۲۰۶۔ قیمت ساڑھے چار روپے۔ ساہتیہ اکادمی نئی دلی سے طلب کی جا سکتی ہے۔

کلموہی

رابندر ناتھ ٹیگور۔ مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین صفحات ۲۷۲۔ جلد مع گرد پوش۔ قیمت ساڑھے سات روپے۔

رابندر ناتھ کے صد سالہ جشن کے موقع پر ساہتیہ اکادمی نے رابندر ناتھ ٹیگور کی منتخب تصنیفات کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس ناول کا ترجمہ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"یہ ناول ان کے ناولوں میں غیر معمولی اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اصل ناول جو گھیر یا لی کے نام سے بنگلہ میں ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا شہرت کے لحاظ سے ٹیگور کے کئی ناول اس سے زیادہ کامیاب ہوئے لیکن قصہ گوئی کے فن میں جو کمال انھوں نے اس میں دکھایا ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ ٹیگور نے اپنے ناولوں میں جتنے نسوانی کردار تخلیق کیے ہیں اس میں اس ناول کی ہیروئن کمودنی سب سے بڑھ کر جیتا جاگتا اور زندگی کی قوت و حرارت سے بھرپور کردار ہے۔"

مشہور ادیب ڈاکٹر سید عابد حسین نے اس کا ترجمہ کیا ہے جو ترجمے کی خوبی اور اچھائی کی ضمانت ہے۔

کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے۔ ساہتیہ اکادمی نئی دلّی سے مل سکتی ہے۔

کیٹلاگ سازی

محمد زبیر اسسٹنٹ لائبریرین، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ناشر ادبی دنیا، علی گڑھ۔ صفحات ۲۵۶ مجلد۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔ کتابت و طباعت گوارا ہے۔

ملک میں تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اچھی اور بہتر لائبریریوں کے قیام کی ضرورت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اب کتابوں کو رکھنا مختلف عنوانات کے تحت انھیں چھانٹنا اور ایک کیٹلاگ تیار کرنا ایک فن بن گیا ہے اس لئے یونیورسٹیوں میں لائبریری سائنس کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔

حاجی محمد زبیر صاحب چونکہ ایک بہت بڑی لائبریری کا عملی تجربہ رکھتے ہیں اور اس فن سے واقف ہیں اس لیے انھوں نے فن کیٹلاگ سازی سے متعلق اردو میں ایک اچھی کتاب لکھ ڈالی ہے، اس کتاب سے ایک طرف لائبریری سائنس کی تعلیم پانے والے طلبا کو فائدہ پہنچے گا اور دوسری طرف وہ تمام افراد اور ادارے بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے جو کسی لائبریری کو چلاتے ہیں یا اس سے منسلک ہیں۔

اردو میں ٹیکنیکل موضوعات پر بہت کم کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ کتاب اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے اس لیے ہر طرح سے ہماری ہمت افزائی کی مستحق ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کتاب کی ایک جلد ہندوستان کی ہر لائبریری میں موجود ہونی چاہیئے۔

آبِ خضر

مرتب۔ کرامت علی کرامت، ناشر اڑیسہ اردو پبلشرز، دیوان بازار کٹک (اڑیسہ) مجلد مع گرد پوش صفحات ۱۷۶، قیمت تین روپے۔ — زیر نظر کتاب اڑیسہ کے پچاس قدیم و جدید شعراء کے مختصر حالات اور کلام کا انتخاب ہے۔ اب تک یہ خیال عام تھا کہ اڑیسہ میں اردو جاننے اور بولنے والے برائے نام ہیں لیکن "آبِ خضر" کے مطالعے سے یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے۔ ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح اڑیسہ میں بھی زمانۂ قدیم سے شعر و سخن کا چرچا رہا ہے جس کا ثبوت شیخ امین اللہ چرخی کا کلام ہے جن کا سالِ وفات ۱۸۷۹ء ہے۔ حصہ اوّل میں ۱۴ شعراء کا کلام ہے جو قدیم دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ بقیہ شعراء کا تعلق جدید دور سے ہے۔ حصہ سوم میں ایسے سات شعراء کا انتخاب دیا گیا ہے جو طویل عرصے تک اڑیسہ میں رہے ہیں۔

کرامت علی صاحب نے یہ مجموعہ مرتب کر کے نہ صرف اڑیسہ کے شاعروں کو متعارف کرایا ہے بلکہ اردو والوں کو بھی اس امر سے آگاہ کرایا ہے کہ اس دور افتادہ علاقے میں اس زبان کو بولنے اور برتنے والے خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ بلاشبہ ان کی یہ کوشش قابلِ مبارک باد ہے۔

موصولات

سازِ دل - ذکی کاکوروی صاحب کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ -
ملنے کا پتہ :- مرکزِ ادب اردو ، انیس منزل نمبر ۱۴۷ ، شاہ گنج لکھنؤ
صفحات ۱۹۶ - قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے -

لوح دقلم مختلف عنوانوں کے تحت آغا عماد الدین احمد صاحب کے تاثرات پر مبنی ایک چھوٹی سی کتاب ہے - قیمت ایک روپیہ -
صفحات ۶۸ - ملنے کا پتہ - آغا عماد الدین احمد صاحب ، شعبۂ سیاسیات ملّت کالج ، دربھنگہ (بہار)

رسالے

اردوئے معلّیٰ (دہلی)

میر سوز نمبر - مرتّبہ خواجہ احمد فاروقی - صفحات ۵۶۰ - قیمت سات روپے - ملنے کا پتہ :- شعبۂ اردو - دہلی یونیورسٹی ، دہلی ۶

میر سوز میر تقی میرؔ ، سودا اور دردؔ کے ہم عصر تھے - گو کہ ان لوگوں جیسی شہرت اور ناموری ان کے حصّے میں نہیں ہوئی لیکن ان میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک اچھے شاعر تھے - ان کا دیوان اب تک شائع نہیں ہوا تھا - دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے مختلف قلمی نسخوں کی مدد سے ان کا دیوان شائع کر کے ایک مفید ادبی خدمت انجام دی ہے -

شروع میں سوز اور ان کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا ایک معلوماتی مقالہ ہے جس میں سوز کی زندگی اور ان کی شاعری کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس طرح ان کے بارے میں جو باتیں مختلف تذکروں اور کتابوں میں بکھری ہوئی تھیں یکجا ہو گئی ہیں -

یہ نمبر سوز پر ایک جامع کتاب کی حیثیت رکھتا ہے - لکھائی چھپائی اور گٹ اپ دیدہ زیب ہے - ہمیں یقین ہے کہ یہ نمبر ادبی حلقوں میں مقبول ہوگا -

رسالہ رہنمائے تعلیم دہلی - ماسٹر جگت سنگھ نمبر
ضخامت ۱۶۰ صفحات - قیمت تین روپے لکھائی چھپائی گوارا ہے - ملنے کا پتہ - رسالہ رہنمائے تعلیم پھاٹک مفتی والاں ، دریا گنج دہلی ۶

ماسٹر جگت سنگھ مرحوم اپنی بے لوث خدمت اور ان تھک محنت کے لیے اردو دنیا میں خاصے معروف تھے - انھوں نے ۱۹۰۵ء میں رسالہ رہنمائے تعلیم جاری کیا تھا اور جسے ۵۷ سال تک نہایت پابندی کے ساتھ نکالتے رہے اور خوشی کی بات ہے کہ ان کی یہ یادگار آئندہ بھی باقی رہے گی -

ماسٹر صاحب نہ صرف اردو کے ایک مخلص کارکن اور فدائی تھے بلکہ ان میں بڑی اعلیٰ انسانی صفات اور خصوصیات بھی تھیں جس کی وجہ سے انھیں جاننے والوں اور ان کی عزّت کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا -

اس خاص نمبر میں ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے ادباء اور شعراء نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے -

موصوف کی زندگی تمام لوگوں کے لیے ایک درسِ عمل ہے - ملک کو ایسے مخلص اور خاموش کارکنوں کی ضرورت ہے جو نام و نمود کی تگ و دو سے الگ رہ کر اپنے کام میں لگے رہیں -

واقعی اس بات کی ضرورت تھی کہ اس عظیم ہستی کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی جائے اور ان کی زندگی کے حالات و واقعات یکجا کر دئیے جائیں - رسالہ مذکور کا یہ خاص نمبر اس ضرورت کو بخوبی پورا کرتا ہے -

امید ہے ادبی حلقوں میں یہ نمبر ضرور مقبول ہوگا - (ش - ح)

ریویو کے لئے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

آجکل

جیشٹھ شک سمت ۱۸۸۶

جون ۱۹۶۴ء

۶۰ نئے پیسے

(نیچے) اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب

وزیراعظم شری نہرو اور صدر ایوب کراچی میں
نہری پانی کے معاہدے پر دستخط کر رہے ہیں
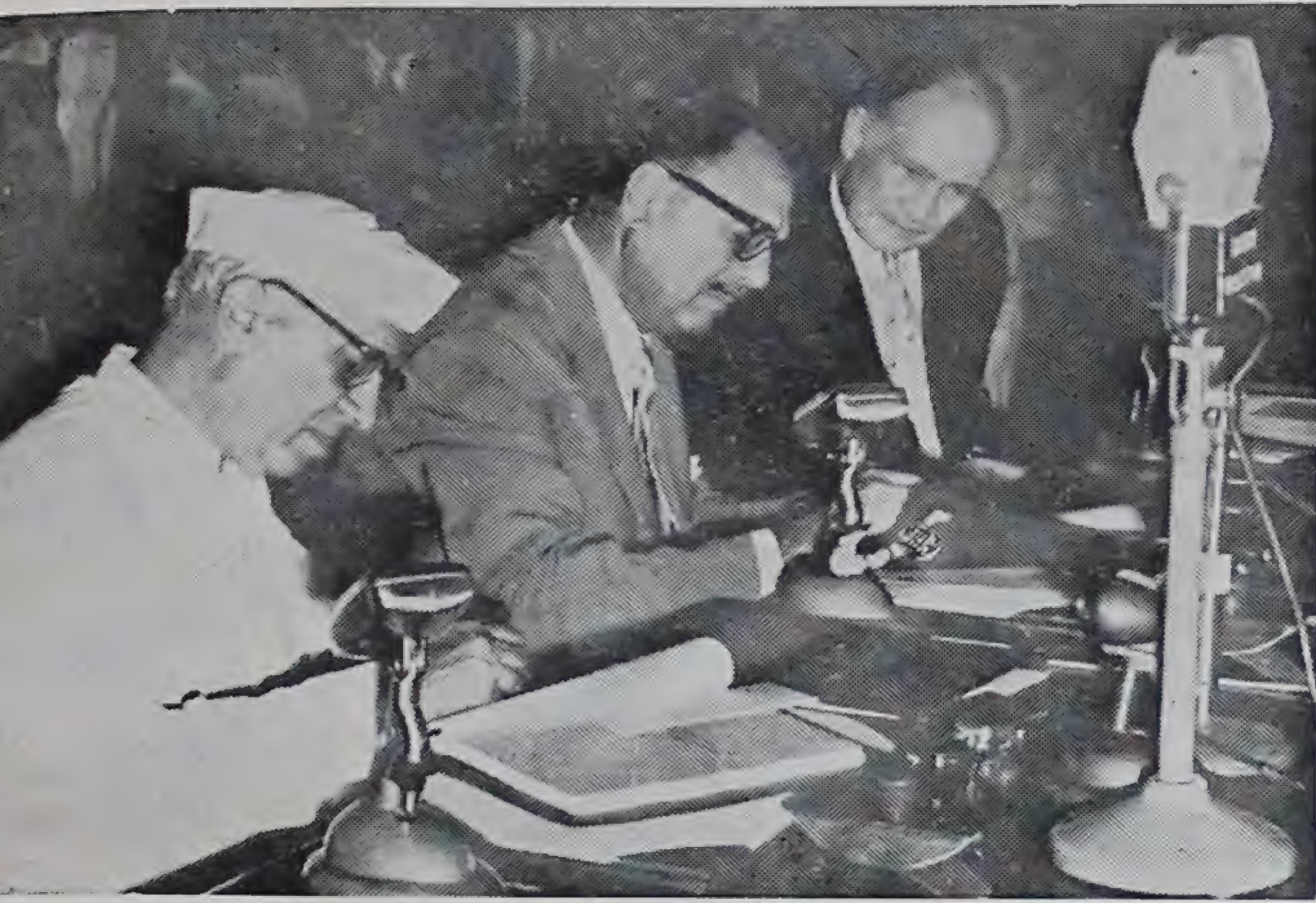
باپو کے ساتھ

کولاسی گلیشیر میں خان عبدالغفار خاں کے ہمراہ

تعزیتی پیغامات

—— امریکہ کے صدر مسٹر جانسن نے صدرِ جمہوریہ ہند کے نام اپنے تعزیتی پیغام میں کہا: —— "ان کے گزر جانے سے خاص طور سے ہم لوگوں کو جس گہرے رنج و غم کا احساس ہو رہا ہے اس کے اظہار کے لیے الفاظ ناکافی ہیں۔ اب تک ہم لوگ اچھائی اور بہتری کے لیے ان کے اثرات پر بھروسہ کرتے رہے تھے اور اس وقت یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تاہم وہ ہمیشہ امر رہیں گے۔ انھوں نے آزاد اور مضبوط ہندوستان کی تعمیر کے لیے جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ میں محفوظ رہیں گی۔ اس کے باوجود وہ صرف ہندوستان کے ہی لیڈر نہیں تھے انھوں نے ساری انسانیت کی سیوا کی ہے۔"

—— روس کے وزیر اعظم مسٹر خروشچیف نے پنڈت جواہر لال نہرو کی موت پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا: —— "صرف ہندوستان کے عوام نے ایک آزمودہ اور عقلمند رہنما کو نہیں کھویا ہے جو ملک کی آزادی کے لیے لڑا اور جس نے اپنی قوم کے بہتر جنم کے لیے ان تھک جد و جہد کی بلکہ دنیا کے تمام ترقی پسند انسانوں کو ایک ایسے انسان کی موت کی خبر سن کر صدمہ ہوگا جو اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک انسانیت کے اعلیٰ تصور نیز امن و ترقی کے حصول میں لگا رہا۔"

—— مسز اندرا گاندھی کے نام تعزیتی پیغام میں وزیر اعظم برطانیہ نے کہا ہے کہ: —— "آپ کے والد کی موت پوری دولتِ مشترکہ کے لیے ایک زبردست نقصان کی حیثیت رکھتی ہے۔"

—— ملکہ الزبیتھ نے اپنے سندیس کہا۔ "مجھے ان کی موت کا گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ دولتِ مشترکہ کے تمام ممالک نیز دنیا کے تمام امن پسند لوگ ان کا ماتم کریں گے۔"

—— یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو کو وزیر اعظم شری جواہر لال کی موت سے بے حد صدمہ پہنچا۔ انھوں نے ایک بیان میں کہا۔ "ناوابستہ ممالک نے اور ترقی کرنے والے ملکوں نے بلکہ وسیع معنوں میں پوری دنیا نے امن کا ایک ایسا عظیم مجاہد کھو دیا ہے جو بین اقوامی مسائل سے اچھی طرح واقف تھا اور جس نے دنیا کو تباہی سے بچانے کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا تھا کیا۔"

—— پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں نے اپنے تعزیتی پیغام میں اس عظیم سانحہ کے موقع پر اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

—— جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہیتو نے صدر جمہوریہ ہند کے نام ہمدردی اور تعزیت کا تار ارسال کیا ہے۔

—— ملائیشیا کے وزیر اعظم ٹنکو عبدالرحمان نے کہا۔ "ان کی موت نہ صرف ہندوستان اور ایشیا بلکہ پوری انسانیت کے لیے نقصان عظیم ہے۔"

—— کمبوڈیا کے سربراہ حکومت شہزادہ سہانوک نے اپنے ایک بیان میں کہا: —— "نئے ہندوستان کے معمار اور اس صدی کے عظیم ترین رہنماؤں میں ایک رہنما کو موت نے ابھی ہم سے چھین لیا ہے۔"

—— پوپ پال ششم نے بھی حکومت ہند کو اپنا تعزیتی پیغام بھیجا ہے۔

—— گھانا کے صدر انکرومہ نے کہا: —— "ہندوستان کے لوگوں نے ایک عظیم رہنما اور دنیا نے ایک زبردست مدبّر کھو دیا ہے۔"

—— عرب لیگ کے سیکریٹری جنرل جناب عبدالخالق حسونا نے کہا کہ "عربوں نے دنیا میں اپنا ایک زبردست دوست کھو دیا ہے۔"

—— چین عوامی جمہوریہ کے وزیر اعظم مسٹر چاؤ۔ این لائی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا: —— "شری جواہر لال نہرو کی موت کی خبر سن کر مجھے دکھ ہوا۔" آگے چل کر انھوں نے کہا: —— "مجھے یقین ہے کہ بھارت اور چین کے تعلقات پھر بحال ہوں گے اور پر امن بقائے باہم کے پانچ اصولوں کی بنیاد پر فروغ پائیں گے۔"

—— اس کے علاوہ ساری دنیا نے یک زبان ہو کر بھارت کے اس مہان سپوت کی موت کو دنیا کے لئے نقصانِ عظیم قرار دیا ہے۔

نہرو نے کہا...!

— ہندوستان ایک قدیم ملک ہے۔ ہمیں اس کی روایتوں کو قائم رکھنا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں سائنسی اور تکنیکی شعبوں میں دوسرے ممالک سے پیچھے بھی نہیں رہنا ہے۔ ہم بیل گاڑی والی ذہنیت رکھتے ہوئے موٹر کار کے اہل نہیں ہو سکتے۔

— اجتماعی کوششوں کے ذریعہ ہمیں ضرورت کی چیزیں پیدا کرنی چاہئیں جو صرف دفاع ہی کے لیے نہ ہوں بلکہ ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہوں۔

— بیرونی خطرہ وقتی نہیں یہ بہت عرصہ تک چل سکتا ہے۔ اگر ہم ملک کی ترقی کے کاموں میں کاہلی سے کام لیں گے تو یہ بہت برا ہوگا۔

— زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ ضروری ہے تاکہ دفاعی تیاریوں کی بنیاد مضبوط ہو۔

— اگر ہمیں ملک کو مضبوط کرنا ہے تو زراعت اور صنعت میں سست رفتاری کو چھوڑ کر بہت تیزی سے کام کرنا ہوگا۔

— سائنسی طریقہ اپنانے وقت میں یہاں تک کہوں گا کہ پرانے ہلوں کو جلا ڈالو اور کسانوں کو مجبور کرو کہ وہ جدید زرعی آلات استعمال میں لائیں۔

— جنگ کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔ صرف زندگی سے ہی نہیں بلکہ انسانی ذہنوں سے بھی۔

— ستارے ہمارے نصیب نہ تو بناتے ہیں اور نہ بگاڑتے ہیں بلکہ یہ صرف ہم ہی ہیں جو اپنی تقدیر بنانے کے ذمہ دار ہیں۔

— زیادہ وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ہمت و عمل سے کام لیتے ہیں۔۔ بزدل شاذ ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

— وہ نظام جس کی بنیاد سرمایہ داری پر رکھی گئی ہے۔ ہمارے حالات کے لیے بالکل موزوں نہیں۔

— ہماری نگاہ ہمیشہ مستقبل کی طرف ہونی چاہیئے اور کسی مقصد کے لیے اعتقاد اور پوری قوت کے ساتھ جدوجہد کرتے رہنا چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ ماضی کی وراثت کو محفوظ رکھنا اور اس سے تقویت حاصل کرنا چاہیئے۔ تبدیلی ناگزیر ہے مگر تسلسل بھی ضروری ہے۔

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل دہلی

ترتیب

جلد ۲۳ — نمبر ۱۱

جیشٹھ شک سمہ ۱۸۸۶

جون ۱۹۶۴ء

سالانہ چندہ:۔
- ہندوستان میں:۔ سات روپے
- پاکستان میں:۔ سات روپے (پاک)
- غیر ممالک سے:۔ ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ:۔
- ہندوستان میں:۔ ۶۰ نئے پیسے
- پاکستان میں:۔ ۶۰ پیسے (پاک)
- غیر ممالک سے:۔ ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

جہانِ غالب

(۱) دانشمندانِ آذربایجان، مصنفہ محمد علی تربیت میں محمد حسین برہان ابن خلف تبریزی جامع برہانِ قاطع اور اس کی کتاب کی بحث ہے، اور اس میں ضمناً غالب کا ذکر آیا ہے۔ تربیت برہانِ قاطع کے متعلق رقمطراز ہیں:

"جامع ترین فرہنگہای پارسیست، و مولف آن بعضی کلمات اجنبی و غیر پارسی را نیز کہ در نظم و نثر فارسی معمول بودہ و ہست ہمہ را جمع آوری کردہ، و در این مجموعہ مندرج ساختہ است، ولی مانند سائر فرہنگہا محتاج تنقیح و تصحیح است، ولذا (کذا) بعضی از ادبای ہند مانند غالب دہلوی وغیرہ درخصوص این کتاب حواشی[1] و تعلیقات عدیدہ بعنوان مختلفہ مثل قاطع برہان و ساطع برہان و رافع[2] ہذیان و محرق قاطع برہان و تیغ تیز و تیغ تیز تر[3] وغیر آنہا مشتمل بر رد و انتقاد یکدیگر نوشتہ و نشر کردہ اند...."

(۲) آقائے علی اصغر، حکمت نے جو متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور وزیر ایران متعینۂ دہلی رہ چکے ہیں فرہنگستان ایران (ایران کی مقتدر ترین ادبی انجمن) کے ایک خاص جلسے میں جو برہان کے "ذکر خیر و تجلیل نام" کی غرض سے تالیف برہانِ قاطع کے ٹھیک ۳ سو سال بعد منعقد ہوا تھا، ایک بسیط مقالہ پڑھا تھا جو نامۂ فرہنگستان (شمارہ ۱ سال ۳) میں درج ہے۔ تربیت کے عبارات اسی سے ماخوذ ہیں اور ان کے معاً بعد آقائے حکمت یہ لکھتے ہیں:

توضیح آنکہ قاطع برہان تالیف میرزا اسد اللہ[4] غالب دہلوی شاعر معروف و ساطع برہان بر این تالیف شیخ رحیم[5] ہندیست و رافع برہان رد بر این رد است[6]، تالیف نجف علی خان جھجری[7]" ص ۱۹

مقالے کے آخر میں مرقوم ہے:

نباید توقع داشت کہ کتاب برہان قاطع فرہنگی باشد در عرض یا شبیہ بکتابہای لغت کہ امروز علمای فیلولوژی[8] باسبک و متد[9] جدید میپسندند و متضمن تحقیقات دقیق و کامل در ریشۂ لغات و ضبط آنہا بلہجہ ہای مختلف

---

1. قاطع برہان وغیرہ کو حواشی و تعلیقات کہنا ٹھیک نہیں۔ مزید یہ کہ اگر حواشی و تعلیقات ایک ہیں تو ان میں سے ایک زائد ہے اور یہ دعویٰ ہو کہ دو ہیں تو اس کا اثبات مشکل ہے
2. رافع حکمت کے یہاں بھی، مگر صحیح دافع ہے۔
3. صحیح شمشیر تیز تر
4. اضافۂ خان ضروری ہے
5. شیخ رحیم صحیح نہیں، مرزا رحیم بیگ رحیم چاہیئے۔
6. اس کا کیا مطلب؟ دافع برہان کا کچھ تعلق رحیم کی کتاب سے نہیں اس کا سروکار محرق قاطع برہان مصنفۂ سعادت علی سے ہے
7. جھجری چاہیئے
8. فایلولوجی
9. Method

بلکہ آن را کتابی باید دانست کہ در سیفد سال مردی ایرانی[۱۰] در یکی از بلاد اقصای ہندوستان با داشتن معلومات معمولی آن عصر و با وسائل و اسباب محدود نگاشتہ است، و لغت را امکان از لغات و کلمات مختلفہ کہ در زبان فارسی رواج داشتہ است در آن جمع کردہ، و کتاب وی از مرتبۂ معلومات و ادب متداول عصر و زمان او پا بیشتر نیست۔ خود او عذر ہر گونہ سہو و اشتباہ سخنان خود را بدینگونہ خواستہ است . . . . . :

"استدعا از اہل تمیز و انصاف کہ عارفان انجمن دانایی و بینایی اند آنست کہ چون بلفظی . . یا معانی فقیمنہ و امثال آنہا برخورند زبان اعتراض را لگام خاموشی و دیدۂ عیب ساز را سرمۂ پردہ پوشی بکشند، چہ فقیر جامع لغات و تابع ارباب لغتست، نہ واضع . . . ."

۱۰ حکمت کو برہان کے ایرانی سمجھنے میں مطلق تامل نہیں۔ غالب کبھی تو اسے بوہرہ دکنی لکھتے ہیں، اور کبھی یہ کہ اس کا باپ دادا ایران سے آیا ہوگا، خود ہندوستان میں متولد ہوا۔ اس بنا پر کہ برہانِ قاطع کا مولف ایران سے مطلق واقف نہیں معلوم ہوتا، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر یہاں متولد نہیں ہوا تو بڑی کم عمری میں یہاں آیا ہوگا۔ رہے اغلاط، تو جیسی غلطیاں اس سے سرزد ہوئی ہیں، ایرانیوں سے بھی سرزد ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں حامیانِ غالب نے فرہنگ انجمن آرای ناصری مؤلفہ ہدایت کا نام لیا ہے۔ وہ برہان قاطع سے متعلق نزاع سے بالکل بےخبر معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی فرہنگ میں متنازعہ فیہ لغات کم از کم ۸۰ فیصدی برہان قاطع کے مطابق ہیں۔ خود اس نے ایسی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ (مفصل بحث جہان غالب کی ایک قسط میں جو معاصر میں چھپی تھی ملاحظہ ہو) حامیانِ غالب کا وہم ہے کہ قاطع برہان میں جو کچھ ہے اس سے بعض امور کو چھوڑ کر ایرانی متفق ہیں۔ برہانِ جامع میں جو ایک ایرانی کی تالیف ہے اور قاطع برہان سے قبل چھپی تھی، ۹۰ فی صدی یا اس سے بھی زیادہ لغات متنازعہ فیہ برہان قاطع کے مطابق ہیں۔ ڈاکٹر محمد معین نے غالب پر جو میرے اعتراضات "غالب بحیثیت محقق" میں (نقد غالب) ہیں، انھیں دیکھ کر اپنے خط میں مجھ سے اپنا اتفاق ظاہر کیا ہے۔

(۳) ڈاکٹر محمد معین، استاذ دانشگاہ تہران نے برہان قاطع کا ایک ناقدانہ نسخہ ۴ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ جلد آخر کی اشاعت کو چار پانچ برس گزرے ہوں گے۔ جلد ا کے دیباچے میں انھوں نے قاطع برہان اور اس کی مخالفت یا موافقت میں جو طویل و قصیر کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کا بیان ہے :

قاطع برہان تالیف میرزا اسداللہ غالب خان[۱۱] دہلوی شاعر معروف (۰۰ ۱۲۱۲ - ۰۰ ۱۲۸۵) است و آن انتقادیست بر برہان قاطع غالب در مقدمۂ قاطع برہان گوید : "... ہرگاہ غم تنہائی رو[۱۲] آوردی برہان قاطع را نگریستی۔ چون آن سفینہ . . مردم را از راہ میبرد . . جادہ نمایان ساختم تا بیراہہ نپویند . . . با این ہمہ کوشش کہ در جدا کردن راست از کاست مرا بود انتوشتہ ام مگر از بسیار اندکی، چنانکہ بی مبالغہ میگویم از صد یکی ہمانا نخواستم نوشت و میدانستم نوشت اما بسبب انبوہی بیا نہای ژولیدۂ جامع مجموع نتوانستم نوشت . . کتاب آسمانی نیست کہ چون و چرا در آن نگنجد۔ گفتار آدمی ہست[۱۳]، ہر کہ خواہد بمیزان نظر سنجد . . " نمونۂ از انتقادات غالب درین کتاب : (عبارت برہان قاطع کے بعد) "آبدار نہ لفظیست کہ در شمار لغات جا تواند یافت و از بہر آن ہموزن باید آورد۔ ہمہ دانند کہ صفت جواہر و اسلحہ میتواند بود۔ اسم گیاہ محل تامل و بمعنی صاحب سامان و مالدار زنہار نیست، آن آبمند است نہ آبدار"

. . بر پروشان بوزن پردہ پوشان بمعنی امت میغرماید، ہموزن را بمیزان نظر باید سنجید، بہ پروشان از پردہ پوشان در وزن بمقدار یک ہای ہوز کمست[۱۴]۔ یکی از معتقدان

۱۱ اسداللہ خاں غالب چاہیئے۔

۱۲ غالب نے رو نہیں، زور لکھا ہے۔

۱۳۔ غالب نے "آدمیت" لکھا ہے۔

۱۴ ہای پردہ غیر ملفوظ ست

این کتاب گفت کہ قصور کاتی نویس است کہ یای فارسی را بارای
بنقطہ متصل نوشت۔ اگر بدین صورت بر پہ روشان نوشتی
در وزن برابر آمدی۔ گفتم گرفتم کہ چنینست بر پہ روشان زبان
کدام سرزمینست۔ گفت در اقصای ملک دکن جنیاں بدین زبان
سخن میکنند۔ گفتم یاد دار پرسان بمعنی امت آمدہ امالی مضاف
الیہ نیارند یعنی پرسان فلان نبی، و آن خود پیداست کہ بر بمعنی
علی و سان بمعنی طرز و اسلوبست[۱۵]۔"

برہان قاطع" تومن با اول تباتی مجہول رسیدہ میم مفتوح
بنون زدہ، قصبہ را گویند کہ صد پارہ دہ در تحت آن باشد،
و جمع آن تومانست، و بعضی گویند ترکیست" قاطع برہان
"و بعضی گویند ترکیست، مگر در گمان جامع عربیست کہ جمع آن
تومنات آوردہ۔ نی نی بیچارہ این لغت را از سومنات
آورد، و او را مجہول بنویسید، و او خود کجاست کہ مجہول
صفت آن افتد۔ دیگر صد پارہ دہ منش فرزانگان را بہم میزند
پارہ دہ یعنی چہ؟ و او آنست کہ لفظ ترکیست و در تحریر
لغات ترکی، اعراب بالحروف نوشتن رسم افتادہ است،
واو علامت ضمہ تای فوقانی والف علامت فتحہ
میم ہر آینہ تومان مینویسند تمن خوانند بتای مضموم و میم
مفتوح و تمن در ترکی بیت[۱۶] را گویند، و یونہ صدرا
و منگ بمیم مکسور و نون ساکن ہزار را۔

برہان قاطع" نمید بفتح اول بر وزن رمید، ماضی نمیدن
است، یعنی میل کرد و توجہ نمود و نم کشید و امیدوار
شد و بضم اول مخفف ناامید و نومید شد" قاطع برہان" در
ہر گام لغزشی و در ہر خطوہ خطا۔ نمیدن اگر از نم بطریق

[۱۵] وجہ اشتقاق عامیہ رک بر پہ روشان در متن و حاشیہ۔

[۱۶] ۔ یعنی بیت تومان در ترکی ۱۰۰۰، است چغتائی ۲۴۶ رک
متن برہان تومن۔ حواشی ۴ تا ۱۶ لفظ تومن تک ڈاکٹر محمد معین کے
ہیں لفظ صحیح بیت ہے، غالب عموماً بت لکھتے ہیں۔ برہان کے
مطابق بھی ی چاہیئے جلد ۱ صـ۳۳۷

تفنن مصدری آفرینند بمعنی نم کشیدن سزاوار، و نمید
نیز بدین [دجہ[۱۷]] ماضی آن خواہد بود، بمعنی میل کردن و
میل کرد از کہ شنید؟ این ہم اگر بودہ باشد گو باش۔
معنی نمید امیدوار شد چگونہ جائز باشد؟ حال آنکہ خود
مینویسد کہ بضم نون مخفف نومید است، نمید مخفف نومید
و نمیدی مخفف نومیدی مسلم، نون را مضموم چرا ساخت؟
در تخفیف تغیر اعراب رسم نیست، نون نومید و نومیدی
مفتوح الاصل است بکدام عارضہ ضمہ را بخود در پذیرد؟
چنانکہ دیدہ میشود در برخی موارد حق با غالبست و
در برخی دیگر ایراد نابجاست و در مواضع بسیار نزاع
لفظیست و کرای گفتن نکند۔ قاطع برہان در ۱۲۷۸ قمری در
نولکشور بطبع رسیدہ

محرق قاطع برہان (فارسی) تالیف سید سعادت علی۔۔
کہ در سال ۱۲۸۰ قمری مطابق ۱۸۶۴ میلادی در مطبع احمدی
دہلی بچاپ رسیدہ و آن ردیست بر قاطع برہان غالب

ساطع برہان (فارسی) تالیف میرزا رحیم بیگ میرٹھی۔
مولفہ بسال ۱۲۷۶ قمری و آن در سال ۱۲۸۲ قمری در
مطبع ہاشمی میرٹھ چاپ شدہ آنہم ردیست بر قاطع برہان غالب

موید برہان (فارسی) تالیف آغا احمد علی شیرازی
جہانگیر نگری ۔۔ مولفہ بسال ۱۲۸۰ قمری و آن در سال
۱۲۸۲ قمری مطابق ۱۸۶۶ میلادی در مطبع مظہر العجائب
کلکتہ بطبع رسیدہ است آنہم ردیست بر قاطع برہان
غالب۔

قاطع القاطع (فارسی) تالیف امین الدین دہلوی ۔۔
مولفہ بسال ۱۲۸۱ ۔۔ و آن در ۔۔ ۱۲۸۳ ۔۔ در مطبع مصطفائی
دہلی چاپ شدہ ۔۔ رد ۔۔ قاطع برہان ۔۔

دافع ہذیان (فارسی) تالیف نجف علی خان جھجری متخلص
بہ نجف متوفی بسال ۱۲۹۰ ۔۔ طبع ۱۲۸۱ مطابق ۱۸۶۵

[۱۷] ۔ قاطع برہان و معنی۔

اکمل المطابع دہلی جواب محرق قاطع برہان۔

لطائف غیبی (اردو) بنام سیاح ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۵ء اکمل المطابع رد محرق قاطع برہان "ظاہراً غالب .. آں را بنام شاگرد خویش شہرت دادہ است۔"

سوالات عبدالکریم (اردو) بنام عبدالکریم رد محرق اسی سنہ میں اسی مطبع میں چھپا۔ "احتمال قوی میرود کہ تالیف خود غالب باشد۔"

نامۂ غالب از غالب رد ساطع برہان ۱۸۶۵ مطبع محمدی دہلی (اردو) قطعۂ غالب (فارسی) از غالب ۱۲۸۲، اکمل المطابع

ہنگامۂ دل آشوب حصۂ اشتمل بر قطعات غالب و فدا و باقر و سخن سب ایک ہی زمین میں۔ ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء مطبع سنت پرشاد آرہ حصۂ ۲: قطعہ جواہر سنگھ جوہر در جواب قطعۂ غالب "باقر و سخن ہر دو جواب قطعہ ہا سے جوہر و فدا ہر یک دو قطعہ سرودہ اند در ہمیں ہنگام ... شمس .. در روزنامہ اودھ اخبار (.. ژوئن[۱۸] ۱۸۶۷..) مقالہ نوشتہ است کہ در آں بر بعض اشعار غالب ایراد کردہ است۔ سخن در جواب اعتراض او بنثر اردو و باقر بنثر فارسی مقالہ نوشتہ اند۔

محمد امیر لکھنوی متخلص بہ امیر (امیر مینائی) در حمایت غالب قطعۂ یا دو سرودہ در روزنامہ اودھ اخبار منتشر کرد۔ مجموع پنج قطعہ منظوم و دو مقالۂ منثور مذکور" ۱۲۸۴ = ۱۸۶۷ مطبع مذکور۔

تیغ تیز (اردو) از غالب جواب موید برہان مولفہ ۱۸۶۷۔ اکمل المطابع۔

تیغ تیز تر مشتمل بر چہار قطعہ مندرج در ہنگامۂ دل آشوب بعلاوۂ جواب قطعات باقر و سخن توسط فدا۔"

شمشیر تیز تر (فارسی از آغا احمد علی شیرازی مؤلفہ ۱۸۶۷ مطبوعہ مطبع نبوی ۱۸۶۸ رد تیغ تیز۔

حاشیہ متعلق آبدار ص۵ "بمعنی نخست، خادمیکہ مامور تہیۂ مشرو باتست صاحب رتبہ کہ موظف است اب برای نوشیدن یا لشستشو بامیر و پادشاہ دہد دائرۃ المعارف اسلام

حاشیہ متعلق بر پروشان ص۲۴۹ "این کلمہ تصحیف بر روشنان دقیقی است۔ اسدی در لغت فرس ص ۳۵۸ گوید" بر روشنان است بود۔ دقیقی گوید:

شفیع باش بر شہ مرا بدیں زلت چو مصطفیٰ بر داد بر روشان را ایں کلمہ در پہلوی دار وشینکاں بمعنی مومناں و گروندگانست بر روی سکۂ .. بسال ۶۵ ہجری ضرب ایں جملہ پہلوی ثبوت شدہ (اس کی پہلوی عبارت) .."

حاشیہ متعلق تومن: "تومان بضم اول، ترکی مغولی لغت بمعنی دہ ہزار .. نیز تومان دہ ہزار دینار است .. امروزہ ریال را یک تومان گویند۔"

حاشیہ متعلق نمید: نومید = ناامید .. از عطای خدا نمید مشو۔" سنائی غزنوی "رشیدی" اسد اللہ غالب دہلی .. بر معانی لغت نمید اعتراضاتی دارد کہ .. در مقدمہ .. نقل کردہ ایم۔ رک رشیدی: وقت مرگ و درد آنسوی نی، چوں کدورت رفت پس چوں عجمی مولوی طلحی ردمی۔ در ایران باستان Nam دخم شدن، تعظیم کردن .. رک نماز۔ و نیز (چنانکہ مولف در نمید و نمیدہ گفتہ) بمعنی نم کشید است .." بحث نمیدہ میں شعر نزاری قہستانی ماخوذ از رشیدی: پی رزم بر گرفت آں دل رمیدہ نسیمی بردہ از خاک نمیدہ۔

محرق قاطع برہان سے کر شمشیر تیز تر کی بحث تک ڈاکٹر محمد معین نے جو کچھ لکھا ہے۔ ان کے قول کے مطابق جناب عرشی کی تحقیقات سے کچھ باتیں محل تامل ہیں: (۱) قاطع برہان کی اشاعت(۲)

(۱۸) رک = رجوع کنید۔ ژوئن = جون۔ رسائل متعلقہ قاطع برہان کے متعلق جو کچھ ڈاکٹر محمد معین نے لکھا ہے وہ لازماً مکمل نقل نہیں ہوا، کچھ حذف کر دیا گیا ہے اور اپنی زبان میں ان کے قول کے خلاصے پر بھی اکتفا کیا گیا ہے۔

دفش کاویانی ہے جو اشاعت کی نقل محض نہیں، بلکہ اس میں ترمیم و اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد معین نے اس کا مطلقاً ذکر نہیں کیا۔ (۲) قاطع برہان اشاعت ا بقول غالب ۱۲۷۷ھ میں مکمل ہوئی تھی، سال طبع درج ہے، مگر سال تکمیل کتاب غیر مذکور ہے (۳) مطبع نولکشور کی جگہ صرف "نولکشور" لکھنا درست نہیں (۴) ساطع برہان کا سال تالیف ۱۲۷۶ھ اور جس کتاب کا یہ رد ہے اس کا سال طبع ۱۲۷۸ھ، یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر محمد معین نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ حقیقت یوں ہے کہ قاطع برہان کی قلمی نقل ۱۲۷۷ھ سے قبل رحیم کی نظر سے گزری تھی، اور انطباع قاطع برہان سے پیشتر رحیم نے اس کا رد لکھنا شروع کر دیا تھا، ظاہر ہے کہ مطبوعہ نسخہ ۱۲۸۲ھ میں یا اس کے بھی بعد مطالعے میں آیا۔ (۵) آغا احمد علی کو کسی نے شیرازی نہیں کہا، غالب کا مصرع ان سے متعلق یہ ہے: "خواجہ را از اصفہانی بودن آبا چہ سود" (۶) سوالات عبدالکریم سوالات پر مشتمل ہے، اور فرضی سائل عبدالکریم ہے، اس بنا پر اسے سوالات عبدالکریم کہا جا سکتا ہے، مگر یہ نام اس رسالے میں کسی جگہ درج نہیں (۷) نسخہ مطبوعہ اس کی نقل (عطیۂ مہیش پرشاد، اور عکس (عطیۂ مالک رام) میں نام مطبع یا سال مطبع درج نہیں۔ اکبر علی خاں سلمہ کے خط سے معلوم ہوا کہ نسخۂ رامپور میں بھی یہ باتیں مرقوم نہیں۔ مطبع اور سالِ طبع کے متعلق اطلاعات کہاں سے حاصل ہوئے (۸) "تیغ تیز تر" جہاں تک میرا علم ہے کسی کتاب کا نام نہیں، "شمشیر تیز تر" ردّ تیغ تیز کے آغاز سے پہلے کسی خاص نام کے بغیر غالب، فدا (دو قطعے) باقر وسخن کے قطعات ہیں (ص ۲ تا ص ۱۵)، اس مجموعۂ قطعات کو تیغ تیز تر کس طرح کہا جا سکتا ہے؟ (۹) ہنگامۂ دل آشوب کی بحث میں ایک قطعے کے مصنف امیر مینائی بتائے گئے ہیں، ان کا اس سے کچھ سروکار نہیں۔ ممکن ہے کچھ اور باتیں بھی محلِ نظر ہوں، اگر یہ گمان صحیح ثابت ہوا تو بعد کو ان کے متعلق لکھا جائے گا۔

یہ بات قابلِ ذکر تھی کہ قاطع برہان کی اشاعت ۲ میں غالب نے محرق قاطع برہان میں سنائی کا ایک شعر جس میں آبدار = صاحب سامان و مالدار یا مرد با اقتدار آیا ہے، یہ لکھا تھا:

عزیزی در شعر حکیم سنائی نشان داد، گفتم شعر سنائی سند کامل و من حیث المعنی جائز اما ہمعنان و ہمسران سنائی ترک کردہ اند، وجہ ترک اینست کہ از دیرباز در کارخانہای سلطنت آبدار خانہ نام تحویلدار آن خانہ آبدار مینویسند، ہر آینہ از ردی ایہام تو، ہم اہانت دارد" ڈاکٹر محمد معین دائرۃ المعارف اسلام سے جو کچھ نقل کیا ہے، وہ بہت تشنہ ہے، مگر بخوبی ممکن ہے کہ اس کتاب میں تسلی بخش بحث ہو۔ بہر حال، غالب کا اعتراض اندراج معنی مذکور پر تھا، اور یہ فضول ہے، ارباب لغت، وہ معانی بھی درج کرتے ہیں جو متروک ہو گئے ہیں۔ قرینۂ غالب یہ ہے کہ اشاعت ۲ میں جو اضافہ ہے وہ نکتہ بعد الوقوع ہے پہلے انھیں اس کا علم نہ تھا کہ سنائی یا کسی اور شاعر کے یہاں اس طور پر آیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ کسی اور کے یہاں نہیں، سوزنی کے کلیات میں اس طرح موجود ہے جس طرح سنائی کے یہاں ہے۔ آبدار، عہدہ دار خاص یوسف زلیخا منسوب بہ فردوسی میں آیا ہے، مگر اس کے بعد بمعنی عہدہ خاص فوراً کثیر الاستعمال نہیں ہوا، چنانچہ عہد اکبری سے قبل تک اس کی مثالیں اگر ملیں گی تو بہت کم۔ عرفی کے یہاں آیا ہے اور تذکرہ طاہر نصرآبادی میں آبدار باشی ملتا ہے

برپروشان کی بحث میں بھی اشاعت ۲ میں دقیقی کا شعر کسی مخالف کے یہاں دیکھ کر غالب نے یہ اضافہ کیا ہے: "ضرورت وزنِ نظم لغت را صورت دیگر نمیتوان بخشید، چنانکہ یاداشت و یالشت ہماں یاداش و بالش است، و تبدل شین ... و سین ... با ہمہ گر اصلیت محکم در ضوابط زبان ایران۔ لاجرم برپروشان ہماں برسا لغت باضافۂ حرفی چند در وسط و تبدل سین سعفص بشین قرشت" یہ بھی نکتۂ بعد الوقوع ہے، غالب برسان کو تو مانتے تھے لیکن برپروشان کے وجود کے قائل نہ تھے، شعر دیکھا تو اس کی توجیہ کرنی پڑی۔ ضرورت شعری سے برسان برپروشان کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ یہ سمجھ میں آنے کی بات نہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ فرہنگ جہانگیری وغیرہ اور فرہنگ اسدی غالباً طبع یورپ میں بھی شعر دقیقی میں بہ روشنان نہیں، برپروشان ہے، گو صحیح مقدم الذکر ہی ہے۔

تو ان کی بحث غالب بحیثیت محقق میں دیکھی جائے۔

(۴) کلیات نظم فارسی میں غالب کا ایک قطعہ ہے جس کی بیت ۳ یہ ہے:

ایبکم از جماعۂ اتراک　　در تمامی ز ماہ دہ چندیم

غالب نے اس کے متعلق حاشیے میں لکھا ہے: "ایبک بہمزۂ مفتوح و موحدۂ مفتوح قومی از اقوام ترک" مجھے یاد آتا ہے کہ حالی نے یادگار غالب میں نیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا آغاز ایک ترک لاچین (خسرو) سے ہوا، اور اس کا خاتمہ ایک ترک ایبک (غالب) پر ہوا۔ جناب مہر اپنی کتاب غالب (طبع ا ص۲) میں فرماتے ہیں کہ "غالب قوم کے ایبک ترک تھے۔" جناب مالک رام بھی انھیں ایبک ترک سمجھتے ہیں (ذکر غالب طبع ۲ ص۱۲) میں نے شجرۃ الاتراک وغیرہ میں اسے ڈھونڈا لیکن، نہ پایا۔ کسی اور جگہ بھی ایبک ترکوں کی کسی قسم یا قبیلے کا نام نہیں ملا۔ اپنی تحقیق پر بھروسا نہ کرکے میں نے استاد ذکی ولیدی طوغان سے ان کے ورود پٹنہ کے وقت اس کے متعلق دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا کہ آئی بمعنی ماہ ہے اور یک بمعنی امیر ہے، یہ لقب ہے، ترکوں کی کسی قسم یا قبیلے کا نام نہیں۔ غالب پر تعجب نہیں حیرت اس پر ہے کہ نیر نے جو علم الانساب کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، ایسی بات کیونکر کہی۔

جناب مالک رام سلاجقہ کو ترکان ایبک قرار دیتے ہیں، حالانکہ پرانی کتابوں میں انھیں ترکمان کہا گیا ہے اور ایبک کسی نے انھیں نہیں کہا۔ انھیں مسلم ہے کہ ترک سلجوقی تھے، اس لیے ان کے نزدیک ایبک بھی ہوئے۔

علی احمد جلیلی

غزل

خوشی نے مجکو ٹھکرایا ہے درد و غم نے پالا ہے　　گلوں نے بے رخی کی ہے تو کانٹوں نے سنبھالا ہے

محبت میں خیالِ ساحل و منزل ہے نادانی　　جو ان راہوں میں لٹ جائے وہی تقدیر والا ہے

جہاں بھر کو متاعِ لالہ و گل بخشنے والو　　کسی کے دل کا کانٹا بھی کبھی تم نے نکالا ہے

چراغاں کرکے دل بہلا رہے ہو کیا جہاں والو　　اندھیرا لاکھ روشن ہو اجالا پھر اجالا ہے

کناروں سے مجھے اے ناخدا دور ہی رکھنا　　وہاں لے کر چلو طوفاں جہاں سے اٹھنے والا ہے

ہے بزمِ عاشقی میں روشنی کیسی خدا جانے　　فروغِ شمع ہے یا دل کے جلنے کا اجالا ہے

نشیمن ہی کے لٹ جانے کا غم ہوتا تو غم کیا تھا　　یہاں تو بیچنے والوں نے گلشن بیچ ڈالا ہے

علی وہ زیست کیا جو رات بھر میں ختم ہو جائے
چراغوں کی ہنسی اڑتی ہے تڑکا ہونے والا ہے

آنند نرائن ملا

غزل

یوں نظر پہ پلکوں کے چھائے ہیں گھنے سایے
جھنڈ میں درختوں کے جیسے دھوپ کھو جائے

زندگی کی دوکاں میں ہم نے دل کے سکّوں سے
جب بھی کچھ کیا سودا ہاتھ اشک ہی آئے

ہو نہ جائے دشمن کا وار کامیاب آخر
دیکھ تیرے دل میں بھی دشمنی نہ آ جائے

دوستی کا لے کر نام لڑ رہے ہیں آپس میں
اس طرف بھی کچھ سایے، اس طرف بھی کچھ سایے

پہلی پہلی الفت کی وہ ادائے معصومی
آپ اٹھائے ہر پردہ اور آپ شرمائے

دل پہ گزری یوں اکثر مصلحت کی دنیا میں
جیسے اپنے پر طائر، تولے اور رہ جائے

آنکھ میں وہی اب بھی آنسوؤں کا موسم ہے
کتنے مہر سنولائے، کتنے چاند کجلائے

دل میں ہر طرف پھیلی چاندنی انھیں کی ہے
وہ لطیف سے غم جو اشک بھی نہ بن پائے

آ ذرا لیں جی بھر کے، دل جواں ہے، رات اپنی
راہِ زیست میں شاید پھر نہ یہ مقام آئے

دردِ زیست کے شایاں ہو چلا ہے دل شاید
آئے اشک آنکھوں میں اور تم نہ یاد آئے

یوں کسی کی یاد آئی جیسے ایک چنچل نار
گھوم گھوم کر دیکھے، دیکھ دیکھ مسکائے

آہ پیریٔ ملاؔ! ورنہ کیا یہ ممکن تھا
زیست اور نظر پھیرے، پاس سے گزر جائے!

بلونت سنگھ

باندھ

شام اونگھ رہی تھی۔

وقت زیادہ نہیں ہوا تھا لیکن آکاش میں دفعتاً کالی گھٹا چھا جانے سے گہری شام کا دھوکا ہونے لگا تھا۔ وسیع گھٹا دبے پاؤں آئی اور پھر نیلے آکاش پر اپنے ہر سے مٹیالے رنگ کا پلستر کر دیا۔ یہ گھٹا اپنی جھولی میں ہوا کا ایک جھونکا تک نہیں لائی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر پیڑ اور ہر پودا ساکت کھڑا تھا۔ آک کے پتے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے وہ ہتھیلیاں پھیلائے بارش کا دان مانگ رہے ہوں۔ ایک تو گرمی کی حدت اور دوسرے ہوا کی غیر موجودگی سے فضا میں گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی۔

گاؤں سے آدھ میل دور بیاس دریا سے نکلنے والی چوڑی نہر جو بجائے خود چھوٹے موٹے دریا سے کم نہیں تھی چپ چاپ بہہ رہی تھی۔ اس کے دونوں کنارے بل کھاتے ہوئے دور کھیتوں میں گم ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ نہر کے کنارے پر شیشم اور ببول کے پیڑ سر اٹھائے کھڑے تھے۔ جو مسافر نہر کی پٹڑی پٹڑی سفر کرتے ان کو ان پیڑوں کی چھاؤں سے کافی آرام ملتا۔

ہاتھوں میں ٹیڑھی میڑھی چھڑیاں پکڑے ڈھیلے ڈھالے تہبند لہراتے کچھ لڑکے نہر کی پٹڑی پر گھوم پھر رہے تھے ان کے مویشی کچھ فاصلے پر گھاس چر رہے تھے۔ یکایک دو لڑکے پٹڑی پر رک گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹوٹتے ہوئے کنارے کو دیکھنے لگے جس مقام سے کنارا کمزور ہو گیا تھا وہاں پر نہر کی لہریں گھوم گھوم کر آتیں اور بار بار سر ٹکراتیں جس سے کنارا گھل گھل کر نہر میں گر رہا تھا۔ ان لڑکوں کی دیکھا دیکھی باقی ساتھی بھی وہاں آ گئے۔ ٹوٹتے ہوئے کنارے کا منظر دیکھ کر ان کے بدن میں کپکپی سی پیدا ہوئی۔ آنے والے خطرے کا احساس کر کے وہ ایک دم ہی گاؤں کی طرف بھاگ نکلے۔ وہ زور زور سے چلا رہے تھے۔ چلاتے سمے ان کے کان لال ہو گئے اور ان کے گلے کی نیلی نیلی رگیں ابھر آئیں۔

گاؤں کے باہر دھریک کے پیڑوں کے جھنڈ تلے چارپائیوں پر بڑے بوڑھے اونگھ رہے تھے یا شطرنج چوپڑ وغیرہ کھیل رہے تھے۔ تین بجے ان کے آرام کرنے کا وقت تھا۔ شاید اب تک وہ کھیتوں کو جانے کی طیاری کرنے لگتے لیکن آسمان پر چھاتی ہوئی گھٹا نے فضا میں کالی کالی دھول پھیلا دی تھی۔ چنانچہ وہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

دور سے لڑکوں کے چلانے کی آوازیں سن کر پہلے تو وہ یہی سمجھے کہ شاید جوہڑ میں گھسی کسی کی گائے کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ جلد ہی ان الجھی ہوئی آوازوں کے الفاظ صاف سنائی دینے لگے۔

"نہر دا کنڈا ٹٹڑا دا اے بیبیا۔"

نہر کا کنارہ ٹوٹ رہا ہے — اتنا سنتے ہی وہ سب ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اسی وقت بادل اس قدر زور سے اور اتنے طویل وقفے تک گڑگڑائے جیسے کسی غیبی ہاتھ نے آسمان کو ٹاٹ کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھاڑ دیا ہو — موٹی موٹی بوندوں کے

بھاگے - آڑے ترچھے - دھرتی پر گرے تو ایک بار ڈھول پھڑپھڑا کر
اوپر کو اُٹھی لیکن لگاتار پانی برسنے سے ڈھول جیسے اُٹھی تھی ویسے ہی
بیٹھ گئی -

گاؤں کے ایک سرے پر بنے ہوئے کچے مکان میں سوتی ہوئی
رانو بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی - پہلے تو اس کی نظر صحن کی طرف گئی جہاں
اس کی ماں چارپائیاں اُٹھا اُٹھا کر انھیں چھپر کے نیچے دیوار کے ساتھ
ٹکا رہی تھی - پھر رانو اُٹھ کر بھدی سی کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی -
اس کھڑکی میں لوہے کی سلاخوں کی جگہ چوکور لکڑیاں لگی ہوئی تھیں - رانو
نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں پر سے سوجے ہوئے پپوٹوں کو اوپر اٹھایا
اور دیکھا کہ ہر چہار جانب سے لوگ نہر کی طرف بھاگے جا رہے ہیں -
بعضوں نے جلدی میں پگڑیاں سر پر باندھنے کی بجائے بغلوں میں دبا
رکھی تھیں - انھوں نے تہبند ایک ہاتھ سے اوپر اٹھا رکھے تھے تاکہ
دوڑنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو - اور بعضوں نے تہبند اتار کر کندھوں
پر ڈال لیے تھے اور محض کچھے پہنے دوڑے جا رہے تھے جن کے ازار بند
لہرا لہرا کر ان کے گھٹنوں سے سر پٹخ رہے تھے -

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگ نہر کے کنارے پر جا پہونچے - انھوں
نے دیکھا کہ نہر کا کنارا اتنا کٹ چکا تھا کہ اب اسے ایک دم بند کرنا
ناممکن تھا - نہر کا ابھرا آتا ہوا پانی کنارے کو یوں ٹکریں مار رہا تھا جیسے
پرانے زمانے میں بڑے بڑے ہاتھی قلعہ کا دروازہ توڑنے کے لیے اس
سے ٹکریں مارا کرتے تھے -

سب کی نظریں ٹوٹتے ہوئے کنارے پر جمی ہوئی تھیں - دفعتہً
کنارا کانپا، دھرتی میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی - پھر ٹوٹتے ہوئے
کنارے کا جبڑا دھیرے دھیرے چرنے لگا، اور پھر پھٹ پڑا پانی
پھر کر دھڑدھڑاتا ہوا باہر کی طرف لپکا - اس کے بہاؤ میں آک اور
ببولیوں کے کمزور پودے جڑ سے اُکھڑ گئے اور پھر جھاگ اڑاتے ہوئے
پانی میں ڈوب ڈوب کر اُبھرتے اور اُبھر اُبھر کر ڈوبنے لگے -

جو لوگ ابھی نہر کے کنارے پر نہیں پہونچ پائے تھے انھوں
نے جب گرگراتے ہوئے پانی کے ریلے کو دیکھا تو ایک دم گھوم کر
یوں سرپٹ بھاگے جیسے پاگل ہاتھی ان کا پیچھا کر رہا ہو --- رانو نے
دُور پھٹتے ہوئے کنارے سے پانی ابلتے دیکھا تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں
اور زیادہ پھیل گئیں - جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں تک پھیلے ہوئے
کھیتوں میں لوگ بے تحاشا بھاگے جا رہے تھے - کسی کے سر کا جوڑا کھل
گیا، کسی کا پاؤں رپٹ گیا اور کسی کی ٹانگیں گیلے تہبند میں اُلجھ گئیں -
اچانک ہی رانو نے محسوس کیا کہ جب پانی گاؤں کے قریب پہنچے گا تو
سب سے پہلے انھیں کے مکان سے ٹکرائے گا - کیوں کہ ان کا مکان
نہ صرف گاؤں کے سرے پر تھا بلکہ دوسرے مکانوں کی بنسبت بہت
نیچی سطح پر بھی تھا - ممکن ہے پانی ان کے مکان کے اندر تک گھس آئے
خوف زدہ ہو کر اس نے منھ ڈھیلا چھوڑ دیا اور ایک چیخ نما آواز
حلق سے نکالی --- ماں!"

اگر اس وقت بادل کی گرج، بجلی کی کڑک اور بارش کا شور
نہ ہوتا تو اس کی چیخ گاؤں کے دوسرے سرے تک پہونچتی - ماں اس
کی چیخ کا سبب نہیں سمجھ پائی - وہ بھاگی بھاگی اندر آئی -

"کیوں گلا پھاڑ رہی ہو...... میں صحن میں ہی تو کھڑی
ہوں - آخر ہوا کیا ہے؟"

رانو منھ سے کچھ نہیں بولی - اس نے ہاتھ اُٹھا کر نہر کی
طرف اشارہ کیا - بڑی نہر کے پھٹے ہوئے کنارے میں سے پلک
پلک کر بہتے ہوئے پانی کو اس کی ماں نے بھی دیکھا -

اب اس کی سمجھ میں آیا کہ رانو کیوں اس قدر زور سے چلائی
تھی - بڑی نہر میں پانی کی کمی نہیں تھی اس لیے ٹوٹے ہوئے کنارے سے
جو پانی نکلا تو تھوڑی دیر میں ہی ایک جھیل سی بن گئی جو لمحہ بہ لمحہ
وسیع ہوتی جا رہی تھی - رانو کے مکان کے آگے ایک چوڑا کچا راستہ
تھا - راستے کے دوسرے کنارے پر ریت کی مینڈ تھی - اس وقت
گھر کے مرد کچھ سامان لینے کے لیے شہر کو گئے ہوئے تھے - چناں چہ
ماں بیٹی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ فرش پر رکھے ہوئے
لکڑی کے بھاری صندوقوں اور دوسرے متفرق سامان کو پانی آ جانے
کی صورت میں کیسے اٹھا کر اونچی جگہ پر رکھ سکیں گی -

ماں جس پریشانی سے اندر آئی تھی اسی پریشانی سے باہر
صحن کی طرف نکل گئی ..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے

کیا نہ کرے - رہی سہی کسر بارش نے پوری کردی تھی - الیشور کو بھی مینھ برسانے کا یہ اچھا موقع ملا تھا -

رانو اپنے ہاتھوں سے کھڑکی کی سلاخوں سے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی - وہ دور بہتے ہوئے پانی کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کے ریلے کو اپنی سرمیلی آنکھوں کے جادو سے آگے بڑھنے سے روک دے گی -

نہر پر کھڑے مردوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا - ٹوٹے ہوئے کنارے کو پاٹنے کا ایک ہی طریقہ تھا - پہلے تو لکڑی کی موٹی موٹی بلیاں اس شگاف میں گاڑ دی جائیں - جب بہت سی بلیاں آگے پیچھے گڑ جائیں تو پھر ان میں پکی اینٹوں کے ٹکڑے ڈالے جائیں - یہ سب کچھ ہو چکے تو تسلے بھر بھر کر مٹی ڈالی جائے تو پانی رک سکتا تھا -

اتنا طے کرنے کے بعد انھوں نے چار چار چھ چھ آدمیوں کی ٹولیاں بنا دیں اور ان سب کو الگ الگ کام سونپ دئے - کچھ لوگ بلیاں لینے گیے، کچھ اینٹوں کے ٹکڑے اور کچھ مٹی اور تسلے وغیرہ لینے دوڑے -

بارش نے الگ ایک مصیبت کھڑی کر رکھی تھی، لوگوں کے کپڑے تربتر ہو رہے تھے - ان کے لیے چلنا پھرنا اور دوسرے کام کرنا دوبھر ہو رہا تھا -

سارے مردوں کا جمگھٹ نہر کے قریب ہی ہو رہا تھا، البتہ کام کرنے والے لوگ ادھر اُدھر بکھر گیے تھے - رانو نے اتنا تو سمجھ لیا کہ آتے والے پانی کے ریلے کو روکنا ممکن تھا کیونکہ نہر کا کنارہ جہاں سے پھٹا تھا اُسے پاٹنے میں کافی وقت درکار تھا - کمرے کے باہر اسے اپنی ماں کی گھبرائی ہوئی بے تکی آوازیں اور ادھر اُدھر پڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی -

رانو اپنے سامنے کھیتوں میں ہوتی ہوئی بارش کو اس انداز سے گھور رہی تھی جیسے وہ کوئی اصلیت نہ ہو محض خواب ہو - وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ اسے باہر جا کر اپنی ماں کا ہاتھ بٹانا چاہیئے . . . . یہ طے کر کے باہر جانے کو اس کے قدم اُٹھے ہی تھے کہ راستے کے اس پار کھیت میں اسے ایک آدمی دکھائی دیا جو اپنے کندھوں پر لکڑی کی گز گز بھر لمبی بلیوں اور پکی اینٹوں کے ٹکڑے اُٹھائے ہوئے تھا - رانو پہلے تو یہی سمجھی کہ وہ آدمی اس سامان کو نہر پر لے جا رہا ہے - لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس نے سارا سامان وہیں پٹخ دیا ہے تو وہ جاتے جاتے رک گئی - یہ دیکھ کر اسے اور بھی تعجب ہوا کہ اس نے کھیت کی مینڈ پر بلیاں گاڑنی شروع کر دیں - ان پر وہ پھاوڑے کی اُلٹی طرف سے چوٹیں لگانے لگا - رانو نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا - اس کی آنکھوں کی پتلیاں پل بھر کو رقص کرتی رہیں - مگر سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ وہ آدمی تھا کون، جو سب کام چھوڑ کر اس کے مکان کو پانی کے ریلے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا -

اس بات کا جواب دینا مشکل تھا، کیونکہ اب موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی اور تیز ہوا بھی چلنے لگی تھی - دھرتی سے آکاش تک دھواں دھار ہو جانے کے کارن سب چیزیں دھندلی دھندلی دکھائی دینے لگی تھیں - اور پھر اس مرد کی پگڑی کا ایک شملہ کان پر سے ہوتا ہوا نیچے لٹک رہا تھا جس کی اوٹ میں اس کے چہرے کا بیشتر حصہ چھپا ہوا تھا . . . . ہاں اس کی ٹھڈی پر اُگی ہوئی ڈاڑھی کی جھلک ضرور دکھائی دے رہی تھی . . . .

رانو نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے پہچاننے کی کوشش کی، جیسے آنکھیں پھاڑنے سے وہ شملے کے آر پار ہی تو دیکھ لے گی -

اتنے میں اس کی ماں اندر آئی اور جب اس نے بالکل قریب پہنچ کر کچھ کہنا چاہا تو رانو نے اُسے ٹوک دیا اور سرگوشی میں بولی - " دیکھو ماں! نہ جانے کون کھیت کے کنارے کنارے بلیاں گاڑ رہا ہے - وہ اپنے ساتھ اینٹوں کے ٹکڑے بھی لایا ہے . . . . . . وہ اسی کوشش میں ہے کہ پانی ہمارے مکان تک نہ پہونچنے پائے — مگر ماں! یہ ہے کون ؟ "

ماں نے چندھی آنکھیں اس مرد پر گاڑ دیں - شاید وہ آدمی پھاوڑہ چلاتے چلاتے تھوڑا سا دائیں بائیں گھوما - اسی اثنا میں وہ اُسے پہچان گئی - بولی - " ہوتا کون ؟ یہ تو اپنے گاؤں کا ہی دریامو ہے — "

رانو کو ماں کا چہرہ کچھ عجیب سا لگا - اس نے گھوم کر ماں کے

پہرے پر نظر ڈالنی چاہی ۔ لیکن ماں نے فوراً منہ پھیر لیا اور اپنے گیلے
سیلیپر پھٹپھٹاتی کمرے سے باہر نکل گئی ۔

دریاموں!

یہ نام رانو کے کانوں میں گونجا، اس کے دماغ میں گونجا اور
پھر اس کے سارے بدن میں گونج گیا ۔۔۔۔۔

کچھ دیر تک وہ سمجھ ہی نہ پائی کہ وہ کیا محسوس کرے، اسے
خوش ہونا چاہیئے یا طیش میں آنا چاہیئے ۔ اسے کھڑکی بند کر دینی چاہیئے
یا اسے اداس ہو جانا چاہیئے ۔ وہ ان سب باتوں میں سے کچھ
بھی نہ کر پائی ۔

سیدھی سی بات تھی ۔۔۔۔ دریاموں اس کی طرف دیکھا کرتا
تھا ۔ یہاں تک رانو کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا ۔ کیوں کہ ان کے
گاؤں یا آس پاس کے دیہات میں کون ایسا نوجوان تھا جس کے
پاس سے وہ گزرے اور وہ اسے نظر بھر کر نہ دیکھے ۔ پھر بھی دریاموں
کا ڈھنگ سب سے نرالا تھا ۔ دوسرے لوگ تو اسے بھوکی نظروں
سے دیکھتے ۔ ان کے ہونٹوں پر شرارت ہوتی تھی اور ان کے انگ
انگ سے ہوس پھوٹتی دکھائی دیتی تھی ۔ لیکن دریاموں کی آنکھوں
میں ویرانی ہی ویرانی دکھائی دیتی تھی ۔ اس کے ہونٹ بے رس
اور خشک دکھائی دیتے تھے ۔ اس کا سارا جسم یوں نظر آتا جیسے اس
میں جان ہی نہ ہو ۔ جیسے وہ اپنی ٹانگوں پر نہیں بلکہ لکڑی کی دو بلیوں
کے سہارے کھڑا ہو ۔

جب بھی رانو دریاموں کو اس حالت میں دیکھتی تو اس کا دل
ڈوبنے لگتا ۔ اس کا جی چاہتا کہ یا تو آندھی آئے اور اسے دریاموں
سے کہیں دور، بہت دور جا پھینکے یا دھرتی پھٹ جائے اور
دریاموں اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر ہمیشہ کے لیے اس کی نظروں
سے اوجھل ہو جائے ۔ کبھی کبھی تو راستہ چلتے چلتے رانو کو یکایک محسوس
ہونے لگتا کہ اسے کوئی چپ چاپ دیکھ رہا ہے ۔ جب وہ گھبرا کر ادھر
ادھر نظر دوڑاتی تو کسی گوشے میں دریاموں دکھائی دے جاتا ۔ اسے
یوں لگتا جیسے کوئی ناگ پھن پھیلائے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس
پر گاڑے ہو ۔

رفتہ رفتہ اسے دریاموں سے نفرت ہونے لگی ۔ وہ نہ تو منہ سے
کچھ کہتا تھا، نہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرتا، نہ دل کا حال سناتا ۔۔۔۔۔
حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دریاموں اس سے کیا چاہتا تھا ۔ پھر
بھی اکثر وہ اپنی سہیلیوں سے پوچھتی کہ یہ دریاموں کا بچہ اس سے
چاہتا کیا تھا؟

ایک وقت وہ بھی آیا جب اسے دریاموں بالکل بھوت معلوم
ہونے لگا ۔ اس کے دل و دماغ میں ایک الجھن سی رہنے لگی ۔ جیسے اس
کے دماغ کے کونے میں کسی مکڑی نے جالا تان رکھا ہو ۔ اس جالے میں
مکھیاں پھنس کر بھنبھناتی ہوں ۔ یہ عجیب سا گھناؤنا سا، گندہ سا کھیل
اس کے دماغ کے گوشے میں سدا ہی جاری رہتا ۔ وہ اس جالے کو مکڑی
اور مکھیوں سمیت اپنے دماغ سے نوچ کر پرے پھینک دینا چاہتی
تھی ۔ مگر پھینک نہیں پاتی تھی ۔

اگر دریاموں مختلف بھی ہوتا تو اس سے کیا فرق پڑ سکتا تھا ۔
یہ تو ناممکن تھا کہ وہ رانو کے دل میں جگہ پا لیتا کیونکہ رانو کے دل پر تو
کسی اور نے قبضہ جما رکھا تھا اور وہ تھا ــــ کیہر سنگھ!

کیہر سنگھ کا نہ تو رنگ گورا تھا اور نہ اس کا ناک نقشہ بہت اچھا
تھا ۔ پھر بھی بحیثیت مجموعی وہ بھلا ہی لگتا تھا ۔ جوانوں میں جوان ایسا کہ
ایک ہزار جوانوں میں کھڑا وہ الگ دکھائی دیتا ۔ اپنے قد، سینے کی چوڑائی
اور لمبی باہوں کے اٹھے اٹھے پٹھوں کے کارن اس کے جسم میں شیر کی سی
طاقت معلوم ہوتی تھی ۔ رانو نے دو برس پہلے اسے دیکھا تو معاً اسے یوں
لگا جیسے اس کے سینہ سے دل بے اختیار نکل گیا ہو اور اس کی جگہ بیکراں
درد نے لے لی ہو ۔ وہ پہلا واقعہ یوں پیش آیا:

اس سے گاؤں والوں نے دور سے ڈھول بجنے کی آوازیں سنیں ۔
تو وہ گھروں سے باہر نکل آئے اور رانو کے مکان کے سامنے قطار بنا کر
کھڑے ہو گئے ۔ ڈھول بجانے والوں کا جلوس ان کے مکان کے آگے سے
گزرنے والا تھا ۔ دور سے کچھ لوگ ایک جلوس کی شکل میں چلے آ رہے تھے ۔
انہیں دو کوس آگے جانا تھا جہاں سنت پیارا سنگھ کی سمادھی پر میلہ
لگا ہوا تھا ۔ جلوس کے آگے بھنگڑا ناچنے والے نوجوانوں کا گروہ تھا ۔ وہ
دھاری دار کرتے اور رنگین تہبند لہراتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ۔

ان کی لال یا کالی داسکٹوں پر سیپ کے بٹنوں کی بھرمار تھی۔ کلف لگی پگڑیاں سر پر اجن کے دو طرّے تھے، ایک بائیں کان کو چومتا ہوا اور دوسرا پگڑی کے اوپر لگے کبوتر کی دم کی طرح پھیلا اور اکڑا ہوا۔ پاؤں میں دیسی جوتے جنھیں سرسوں کے تیل میں اچھی طرح چپڑ دیا گیا تھا۔ کانوں میں بالے، موٹے بالوں والی کلائیوں پر لوہے کے بھاری کڑے۔ ڈھول پیٹنے والے پیچھے پیچھے تھے اور بھنگڑہ ناچنے والے آگے آگے۔ ناچتے ناچتے جب وہ گاؤں کے قریب پہونچے تو ان کے لمبے لمبے چمٹوں پر لگی لوہے کی ٹکلیاں اور بھی زور سے جھنجھنا اٹھیں۔ ان میں سب سے زیادہ بلند قامت چوڑے کندھوں اور اونچی گردن والا جوان کیہر سنگھ ہی تھا، جو اس سمے کالی گھٹا کو دیکھ کر مستی میں آئے ہوئے مور کی طرح ٹھمک ٹھمک کر ناچ رہا تھا۔ اس نے اپنا چمٹا دونوں ہاتھوں سے اپنے سر سے بھی اوپر اٹھا رکھا تھا۔ اس کا چہرہ گھوم کر ایک جانب کو جھک گیا تھا۔ اس نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ پاؤں کی تھرکن کے ساتھ اس کے کانوں میں پڑے بالے بھی ٹمک رہے تھے۔ آنکھوں میں لگے سُرمے کی دھاریاں پھیل گئی تھیں۔ اس کی یہ مستی دیکھ کر گاگھڑ بجانے والے سمٹ کر اس کے قریب آگئے۔ لاٹھیوں کے سرے پر بندھی ہوئی گاگھڑوں کی ڈوریاں بار بار جھٹکے کھانے لگیں اور چمٹوں کی چھناچھن کے ساتھ گاگھڑوں کی کنا کٹ نے سماں باندھ دیا۔ جوانوں کے پاؤں تلے سے اٹھنے والی دھول نے کنواریوں کے مکھڑے چوم چوم لیے۔

کیہر سنگھ پاس ہی کے گاؤں کے رہنے والا تھا۔ کبھی وہ رانو کے گاؤں میں بھی آنکلتا تھا لیکن رانو نے اس کے بارے میں محض کہانیاں ہی سنی تھیں اسے دیکھا نہیں تھا۔ اب اس نے کیہر سنگھ کو پہلی بار دیکھا تو اس پر فدا ہو گئی۔

بھنگڑہ ناچنے والوں کا جلوس تو آگے نکل گیا لیکن کیہر سنگھ کی محبت کا تیر رانو کے دل میں پھانس کی طرح اٹکا رہ گیا۔

اس کے بعد رانو نے ہمیشہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے۔ اسے جب کبھی خبر ملتی کہ کیہر سنگھ آیا ہوا ہے تو وہ فوراً کسی بہانے اس کے آگے پیچھے دو چار چکر ضرور لگا لیتی۔

شاید کوئی اور آدمی ہوتا تو رانو اسے سچ مچ ہی اپنے بس میں کر لیتی لیکن کیہر سنگھ کے لیے لڑکی کوئی عجوبہ نہیں تھی۔ اس نے رانو کے جذبات کو بھانپ لیا اور کبھی کبھار اس پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈال لیتا، لیکن اس کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوا۔ اس کی بے رخی سے رانو کے من کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ اور ایسے موقعے بھی آئے جب رات کے اندھیرے میں رانو اس کے پاس جا پہونچی۔ جیسا کہ مردوں کا قاعدہ ہے ایسے موقعوں پر کیہر سنگھ بھی مجبور ہو جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رانو کا پاؤں بھاری ہو گیا...

ڈھائی تین مہینے سے اسے اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ وہ بچے کی ماں بننے والی ہے، کیہر سنگھ ایک اور لڑکی کے ساتھ غائب ہو گیا جس پر وہ کافی عرصے سے ڈورے ڈال رہا تھا۔

رانو کی ماں سے بیٹی کی حالت پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ اس کی کیفیت پر پردہ ڈالے تھی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ راز زیادہ عرصے تک چھپایا نہ جا سکے گا۔ وہ گھرائی گھرائی دائیوں سے دوا دارو پوچھتی پھرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کچھ گرم دوائیں ایسے موقعوں پر کام آسکتی ہیں۔ لیکن ابھی تک اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اسے بدنامی کا بھی ڈر تھا اس لیے کھل کر کسی سے مشورہ بھی نہ لے سکتی تھی۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے توں توں اس کی پریشانی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آخر جب گھر کے مردوں کو پتہ چلے گا تو کیا ہوگا؟ ایک روز جبکہ گھر میں ماں بیٹی کے سوا اور کوئی نہیں تھا، رانو پیڑھی پہ بیٹھی تھی اور ماں اس کے پاس کھڑی ہو کر یکایک سر پیٹنے لگی، اور اپنے بچے کھچے سفید بال نوچنے لگی۔ رانو کچھ نہیں بولی۔ وہ سب کچھ سمجھتی تھی لیکن کیا کہہ سکتی تھی، کیا کر سکتی تھی؟

ماں نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تو پھر اس کے من میں بیٹی کے لیے رحم کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔

اسی وقت بلیوں اور اینٹوں سے لدی ہوئی کچھ بیل گاڑیاں بے ڈھنگے انداز سے بھاگتی ہوئی ان کے مکان کے آگے سے گزریں۔ بیلوں کے کھروں سے کیچڑ کے چھینٹے اڑ کر وریاموں کے چہرے پر پڑے لیکن وہ اسی لگن سے اپنے کام میں جٹا رہا۔ وہ تین چار چکر لگا کر کافی بلیاں اور اینٹوں کے ٹکڑے لے آیا تھا۔ ادھر بیل گاڑیاں نہر کی طرف بڑھ رہی تھیں ادھر وریاموں اپنی ہی دھن میں مگن تھا۔

بیل گاڑیاں جھومتی جھامتی نہر کے ٹوٹے ہوئے کنارے تک پہونچیں۔ وہاں پر لوگ پہلے ہی تیار کھڑے تھے۔ انھوں نے جھٹ کر سامان بیل گاڑیوں سے اُتارا اور پھر تین چار آدمی بڑی مستعدی سے بلیاں شگاف میں گاڑنے لگے۔ وہ بھیگتے بھیگتے کام میں جٹ گئے۔ پیڑوں کی پتوں پر بارش کی تیز بوندوں کی بوچھار کے ساتھ ساتھ ہتھوڑوں کی دھمادھم سنائی دینے لگی۔ بلّی کے بعد بلّی گڑتی جا رہی تھی، لیکن اس بڑے شگاف میں سے نکلتے ہوئے پانی کے بہاؤ میں زیادہ کمی نہیں ہوئی تھی۔ سب جانتے تھے کہ بلّیاں گڑ جانے پر جب اینٹوں کے ٹکڑے ان میں بیٹھ جائیں گے تبھی پانی قابو میں آئے گا اور بالکل بند تب ہوگا جب مٹی کے تسلے بھر بھر کر اس میں ڈالے جائیں گے۔

اسی کام کو دریاموں چھوٹے پیمانے پر کر رہا تھا۔ وہ کھیت کی مینڈ پر چھوٹی بلّیاں گاڑے جا رہا تھا۔ یہ بلیاں اس نے اپنے کھیتوں کے لیے بڑھئی سے تیار کروائی تھیں کیونکہ اس کے کھیتوں کی زمین کافی ڈھالو تھی اس لیے جب اس کے کھیتوں کو پانی لگتا تو وہ بہہ کر دوسرے کھیتوں میں چلا جاتا۔ دریاموں کے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے۔ بلّیاں گاڑ لینے کے بعد اس نے ان میں اینٹوں کی روڑی بھرنی شروع کر دی تھی۔ اور اب وہ تسلے میں مٹی بھر کر اس چھوٹے سے باندھ کو مکمل کرنے لگا۔

رانو کھڑکی کے پاس کھڑی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی اور اب اسے نہر کا پانی قریب آتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس بڑھتے ہوئے پانی کے ریلے کی پیٹھ پر تیزی سے گرتی ہوئی پانی کی بوندیں چابک برسا رہی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے پانی کا یہ ریلا اپنی پیٹھ پر چابک کی مار کی تاب نہ لا کر بلبلاتا ہوا اور بھی تیزی سے بڑھتا آ رہا تھا۔

بھیگنے سے دریاموں کی حالت خراب سے خراب تر ہو گئی۔ اس کی پگڑی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے اس نے گیلا گیلا گوبر اپنے سر پر تھوپ رکھا ہو۔ گاڑھے کا کرتہ بھیگ گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جب اس سے ٹکراتے تو دریاموں کو سردی کی لہر اپنی ہڈیوں تک پہونچتی محسوس ہوتی۔ رہی سہی کسر کیچڑ کی چھینٹوں نے پوری کر دی۔ شاید اتنا بھدا اور بھونڈا وہ پہلے کبھی نظر نہ آیا ہوگا۔ لیکن رانو اسے جیسے اور بدلی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

کیہر سنگھ کے کسی اور لڑکی کے ساتھ بھاگ جانے کی خبر پہلے پہل جب رانو کے کانوں تک پہونچی تو اُسے بڑا غصہ بھی آیا، دُکھ بھی پہونچا اور نراشا بھی ہوئی۔ اگرچہ رات کی تاریکی میں وہ کئی بار اپنے آپ کو ایک طرح سے زبردستی ہی کیہر سنگھ کے حوالے کر چکی تھی ... اس امید میں کہ اس طرح شاید وہ اس کا بن جائے، لیکن اپنے دل کی گہرائیوں میں اسے ڈر بھی لگا آتا تھا کہ شاید وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے کیوں کہ وہ کیہر سنگھ کے دو گلے پن کو محسوس کرتی رہی تھی۔ کیہر سنگھ غائب ہوا تو اسے ویسی جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی جیسی شکاری کو شکار ہاتھ سے نکل جانے پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی نظروں میں آپ ہی گر سی گئی تھی۔ علاوہ ازیں جو پاپ کی گٹھڑی وہ پیٹ میں لیے پھرتی تھی اس کی پریشانی الگ تھی —

آج دریاموں کے اس برتاؤ نے اس کے من کے بوجھ کو انجانے میں ہی ہلکا کر دیا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ دریاموں اتنا غیر نہیں تھا جتنا وہ اسے سمجھتی رہی تھی۔ اسے اس سے دلچسپی سی محسوس ہونے لگی۔ جیسے دریاموں کو اس نے زندگی میں پہلی بار پہچانا ہو۔ سارے گاؤں میں صرف وہی ایک آدمی تھا جسے اس بات کا خیال آیا کہ نہر کا پانی کہیں رانو کے مکان میں نہ گھس آئے۔ جو آدمی اس سے اتنا پریم کرتا تھا کیا وہ اس کی دیوانی جوانی کی ایک لغزش کو معاف نہ کر دے گا کیا وہ بدنامی کے اس طوفان کو جو ان کے گھر کی طرف نہر کے پانی سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے بڑھا آ رہا تھا، روک نہ دے گا۔

اتنے میں ہی پانی کا ریلا کھیت کے مینڈھ سے آ ٹکرایا تو دریاموں اُچھل کر باہر نکل آیا۔ پانی کی سطح دھیرے دھیرے اوپر کو اُٹھ رہی تھی لیکن اب پانی دریاموں کے بنائے ہوئے باندھ کے اوپر سے گزر نہیں سکتا تھا۔

اتنی دیر تک دریاموں نے نہ تو رانو سے آنکھ ملائی اور نہ منھ سے کوئی بات کہی .... رانو کو اس سے اُلجھن ہونے لگی۔ اگر دریاموں کوئی بات چھیڑ دیتا تو اسے کتنی خوشی اور کتنی سہولت ہوتی۔ لیکن اس کے چپ رہنے پر بھی رانو نے بُرا نہیں مانا۔ وہ خود ہی گفتگو کا آغاز کرنے پر آمادہ تھی۔ زندگی میں اس سے بات کرنا تو درکنار اس نے دریاموں پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ اب،

بات شروع ہو بھی تو کیسے؟

اتنے میں بچھڑا دریاموں کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے پانی میں گر پڑا۔ اسے لینے کے لیے وہ پھر پانی میں کود پڑا۔ جب نکلا تو اس کا پاؤں رپٹ گیا۔ وہ گرا تو نہیں لیکن لڑکھڑا گیا۔

اس غیر اہم واقعہ کا بھی رانو نے فائدہ اٹھایا اور بے اختیار ہنس دی تاکہ دریاموں کے کان تک اس کی ہنسی کی آواز پہنچ جائے۔ رانو اتنا تو سمجھتی تھی کہ اس ہنسی سے بات چیت کا دروازہ کھل جائے گا۔ لیکن دریاموں نے پگڑی کا شملہ گھما کر دوسرے کندھے پر یوں پھینک رکھا تھا کہ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ محض آنکھیں نظر آ رہی تھیں جن سے اس کے دل کی کیفیت یا رانو کی ہنسی کے ردِ عمل کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

اپنا کام ختم کر کے دریاموں پرے کو چل دیا۔ اب رانو سے رہا نہ گیا۔ اس نے کچھ لاڈ، کچھ پیار اور کچھ موسیقی سے بھری آواز میں پکار کر کہا "دریاموں!"

دریاموں چلتے چلتے رک گیا۔ رانو کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ نہ وہ گھوما اور نہ منھ سے کچھ بولا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ چپ چاپ اپنی جگہ پر جامد سا کھڑا تھا۔ رانو نے محسوس کیا کہ اب اسے بات چیت کا آغاز کر دینا چاہیئے۔ جلدی میں کچھ سوجھا نہیں تو یونہی ایک بے تکا سا سوال کر ڈالا "پرسوں تمھارے گھر میں کچھ لوگ آئے تھے ۔ ۔ ۔ کیوں آئے تھے وہ؟"

رانو جانتی تھی کہ وہ کیوں آئے تھے۔ پچھلے کافی سمے سے دریاموں کے رشتے کی بات چل رہی تھی لیکن وہ ہر بار کنی کاٹ جاتا۔ جب ایسی خبریں رانو تک پہونچتیں تو وہ سمجھ جاتی کہ دریاموں کس لڑکی کی خاطر رشتے کو ٹھکرا دیتا ہے۔ اس لیے جو لوگ پرسوں آئے تھے ان کے بارے میں بھی اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھی۔

دریاموں چپ تھا ۔ ۔ ۔ رانو کو یوں لگا جیسے وہ چپ چاپ ہی آگے بڑھ جائے گا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کھڑکی کی چوکھٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اپنی ستواں ناک سلاخوں میں سے باہر نکال کر زور سے چلائی تاکہ بارش کے شور کو چیر کر اس کی آواز دریاموں کے کانوں تک پہونچ سکے "میں نے سنا ہے کہ وہ تمھارے لیے لڑکی کا رشتہ لے کر آئے تھے۔"

اتنا سنتے ہی دریاموں ایک دھچکے کے ساتھ آگے کو بڑھا۔ بنا گھوم کر دیکھے، بنا کچھ جواب دیئے وہ بچھوڑے کی مٹھی انگلیوں میں تھامے اسے اپنے پیچھے پیچھے یوں کھینچ رہا تھا جیسے بھنگی مردہ کتے کو دم سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں۔ اپنی بات کا جواب نہ پا کر پہلے تو رانو کو طیش آیا۔ پھر وہ گھبرا سی گئی۔ اس نے زور سے آواز لگائی "دریاموں!"

پھر بھی دریاموں یوں چلا جا رہا تھا جیسے وہ بہرہ ہو ۔ ۔ ۔ اتنے میں رانو کی ماں اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے دھیمے سے غصے بھری آواز میں کہا۔ "مورکھ کہیں کی۔"

اب رانو بری طرح پریشان ہو اٹھی۔ وہ کھڑکی سے پیچھے ہٹ کر گھومی اور ماں کے پاس سے سرپٹ بھاگتی ہوئی گھر کے باہر نکل گئی۔ معاً تیز بارش اور کھلی ہوائیں آ جانے سے اس کا سر چکرا گیا۔ اسے یوں لگا کہ اگر اس نے دوڑنے کی کوشش کی تو وہ چکر کھا کر گر پڑے گی۔ چناں چہ دیوار کا سہارا لے کر وہ رک گئی اور اس نے اپنا گرم گرم رخسار گیلی دیوار پر ٹیک دیا ۔ ۔ ۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آنسوؤں کو بہنے سے روک نہیں پائے گی۔

دور نہر کی طرف سے زور کا شور اٹھا۔ "باندھ بندھ گیا۔ باندھ بندھ گیا۔"

پھر لوگوں نے "جو بولے سو نہال! ست سری اکال" کے نعرے لگائے جو کھیتوں کھیتوں میں گونج گئے۔

بادل جس تیزی سے آکاش پر چھا گئے تھے اسی تیزی سے پھٹ بھی گئے۔ ان پھٹے پھٹے بادلوں میں سے نیلے آکاش کا ٹکڑا مسکراتا ہوا جھانکتا دکھائی دے رہا تھا۔

گھر کے اندر بڑھیا دن کی روشنی کے باوجود چراغ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

دریاموں گاؤں سے کچھ دور واقع ایک اندھے کنوئیں کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں بچپن میں وہ رانو کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔

نہر کے دونوں کناروں پر میلوں تک پھیلے ہوئے بیڑوں کے جلوس کھڑے جھوم جھوم کر پتوں سے تالیاں بجا رہے تھے۔

سید یعقوب

شبلی اور حیدر آباد

۱۸۹۱ء میں سر سیّد نے ایک ڈیپوٹیشن حکومت دکن کے سامنے پیش کیا تو اس وقت شبلی بھی سر سیّد کے ساتھ تھے[۱]

علی گڑھ سے علیحدہ ہونے کے بعد ۱۸۹۶ء میں شبلی حیدر آباد آئے تاکہ انھیں یہاں سے اتنا ہی منصب ملے جتنا کہ وہاں سے وظیفہ ملتا تھا۔ اس دفعہ وہ سیّد علی بلگرامی کے یہاں مہمان کی حیثیت سے تھے[۲]

اس کے بعد شبلی آئے ہیں تو سر رشتۂ علوم و فنون کی خدمت سپرد ہوئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سر وقار الامراء پر سیّد علی بلگرامی کا خاص اثر تھا انھوں نے اپنے ایک دوست سیّد مرتضیٰ افلسفی کی مدد کرنے کے لیے ایک جدید محکمۂ علوم و فنون کی منظوری لی اور اپنے دوست کو اس کا مدد بنایا۔

سیّد علی بلگرامی کو پنشن ہو جانے کے بعد مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سکریٹری ہوگیے تھے، انھوں نے سیّد مرتضیٰ افلسفی کو عدالت دیوانی کا ناظم مقرر کیا اور ان کی جگہ مولوی شبلی کو مامور کیا[۳]

شبلی مولوی عزیز مرزا صاحب کو علی گڑھ کے دورِ اوّل کے بہترین طالب علم کی حیثیت سے خوب جانتے تھے چناں چہ سید رضا علی نے بھی یہ لکھا ہے:

"مولوی عزیز مرزا مرحوم اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم

[۱] کلیاتِ فارسی ص ۱۱

[۲] میری کہانی میری زبانی ص ۳۰۲

[۳] میری کہانی میری زبانی ص ۳۰۲

دورِ اوّل کے بہترین اور ادبی مذاق رکھنے والے طالب علم تھے، ہم عصر ان دونوں کی بڑی قدر کرتے تھے مگر کالج کے ارباب حل و عقد کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکتے رہے۔"[۱]

ان کے علمی ذوق سے متعلق سیّد سلیمان ندوی نے یہ لکھا ہے:

"مولوی عزیز مرزا مرحوم خواجہ غلام الثقلین مرحوم امثالہم کے مغربی فضل و کمال کے چہرے پر اصلی آب و رنگ مشرقی علوم و السنہ کی واقفیت کا تھا۔"[۲]

غرض مولوی عزیز مرزا صاحب کی وجہ سے شبلی سر رشتۂ علوم و فنون کے ناظم مقرر ہوئے۔ اس سلسلہ میں ان کا قیام حیدر آباد میں بقول صاحب تاریخ داستانِ اردو اپریل ۱۹۰۱ء سے جنوری ۱۹۰۵ء تک رہا اور مشاہرہ ماہوار تین سو روپیہ تھا۔[۳] لیکن خود شبلی نے ۱۱مئی ۱۹۰۵ء یم مہدی حسن کے نام جو خط لکھا ہے اس کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ قوسین میں "ناظم علوم و فنون" کے الفاظ لکھے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کم سے کم ۱۱مئی ۱۹۰۵ء تک ناظم سر رشتۂ علوم و فنون تھے۔

شبلی نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ حیدر آباد میں چار سال ملازم رہے، ابوظفر ندوی کے موسومہ خط میں حیدر آباد سے ۱۹۱۳ء میں یہ لکھا ہے

[۱] جامعہ جلد ۳۹ نمبر ۱ بابت جولائی ۱۹۴۳ء

[۲] نقوشِ سلیمانی ص ۱۸۵ و ص ۱۸۶

[۳] تاریخ داستانِ اردو ص ۴۶۵

"میں یہاں چار برس تک ملازم رہا۔ اس زمانہ میں بھی کسی عزیز کو کوئی ملازمت نہ دلا سکا۔"[1]

سررشتۂ علوم وفنون سے متعلق واکرنے ایک کمیشن قائم کیا تھا، ممبرون میں میرزا فضل حسین چیف جسٹس اور سید احمد مددگار صدر مجالس تھے، ان کی رپورٹ پیش ہونے پر یہ محکمہ برخاست کر دیا گیا۔[2]

مولوی محمد سمیع کے موسومہ خط میں اس کمیشن کے متعلق یہ لکھا ہے:

"ایک کمیشن بیٹھی ہے، اس کی رپورٹ پر فیصلہ ہوگا لیکن میں پہلے ہی سے یہاں کی سازشوں سے سخت گھبرا گیا ہوں"[3]

اس دور میں الغزالی، سوانح عمری مولانا روم، علم الکلام، الکلام اور موازنۂ انیس و دبیر کی تصنیف و تالیف عمل میں آئی۔

اس زمانہ میں شبلی نے یہاں انجمن ترقی اردو کے جلسے کیے اور اس کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے متعلق کر دیا گیا۔[4]

انجمن ترقی اردو کی رپورٹ بابت ۱۹۱۳ء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوری ۱۹۰۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا غیر معمولی اجلاس دہلی میں ہوا اور اس کا ایک شعبۂ ترقی اردو قائم ہوا اور اس کے سیکرٹری شبلی قرار پائے۔[5] اس کا یہ مقصد تھا کہ اردو زبان کو ترجمہ و تالیف اور تصنیف کے ذریعہ مشرقی اور مغربی علوم و فنون سے مالا مال کر دیں۔

لیکن نواب علی حسن خاں کے موسومہ خط میں جو ۲۱-اپریل ۱۹۰۲ء کا مورخہ ہے شبلی نے یہ لکھا ہے:

"آپ اپنے فرائض پوچھتے ہیں کیا قواعد انجمن آپ کے پاس نہیں بھیجے گیے۔ ارشاد ہو تو بھیج دوں۔"[6]

نیز اس مکتوب میں لکھا ہے:

"انجمن کی طرف سے میں مصحفی اور میر تقی وغیرہ کا مصنفہ

---

[1] مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۹۲
[2] میری کہانی میری زبانی ص ۳۰۲
[3] مکاتیب شبلی جلد اول ص ۱۱۱
[4] میری کہانی میری زبانی ص ۳۰۲
[5] رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ۱۹۱۳ء
[6] مکاتیب شبلی جلد ۲ - ص ۱۹۷

تذکرۃ الشعرا چھپانا چاہتا ہوں کیا آپ کے کتب خانہ میں ان تذکروں میں سے کوئی ہے۔"

مذکورہ خط سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوری ۱۹۰۳ء سے پہلے ہی انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آ گیا تھا۔ اس کے قواعد بھی مرتب ہو چکے تھے۔ اشاعت کے لیے موزوں کتابوں کا انتخاب بھی ہو چکا تھا۔

اس کی تائید "میری کہانی میری زبانی" کے مندرجات سے ہوتی ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ شبلی نے سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت کے زمانہ میں ترقی اردو سے متعلق جلسے کیے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ یہ انجمن آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے متعلق کر دی جائے۔[1]

انجمن نے جو کام کیا تھا شبلی نے اس کی رپورٹ علی گڑھ گزٹ میں جون ۱۹۰۳ء میں شائع کی تھی۔[2]

اس سلسلہ میں شبلی کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ

(ا) "علوم فنون کی کتابوں کے ترجمہ سے پہلے ضرور ہے کہ اردو زبان میں سائنٹیفک لغت تیار کرا لیا جائے جس میں ان تمام اصلاحات کے لیے نئے الفاظ وضع کیے جائیں جو علوم و فنون میں مستعمل ہیں۔"[3]

اصلاحات کے ترجمہ کے لیے شبلی نے ایک کمیٹی بھی مقرر کی تھی۔

(ب) اس کے علاوہ عربی کتابوں کا بھی اردو میں ترجمہ کرانا چاہتے تھے چناں چہ مولوی حمید الدین صاحب بی۔اے کے موسومہ خط میں یہ لکھا ہے۔

"تم بتاؤ عربی زبان سے کون سی کتابیں اردو میں ترجمہ کے قابل ہیں۔" (مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۰۹)

(ج) اردو اشعار کا علمی انتخاب بھی ان کے پیش نظر تھا چنانچہ ایم مہدی حسن کے موسومہ خط میں یہ لکھا ہے

"میں نے ارادہ کیا ہے کہ اردو اشعار کا ایک عمدہ مجموعہ تیار کیا جائے جس کی ترتیب علمی حیثیت سے ہو، کچھ کام ہو چکا

---

[1] میری کہانی میری زبانی ص ۳۰۲
[2] مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۹
[3] رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ۱۹۱۳ء

ہے ۔" (مکاتیب جلد دوم ص ۲۳۰)

(۵) قدیم اردو کتابیں شائع کرنا بھی ان کے لائحہ عمل میں داخل تھا جیساکہ اس سے قبل نواب علی حسن خان کے موسومہ خط کے حوالے سے لکھ دیا گیا ہے ۔

حاصل یہ کہ شبلی کی معتمدی کے زمانہ میں انجمن ترقیٔ اردو سے متعلق نہ صرف اہم امور پر غور و خوض کیا گیا بلکہ عمل بھی کیا گیا، چناں چہ سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک کتاب بھی شائع ہو گئی تھی۔ ایم مہدی حسن کے موسومہ خط میں یہ لکھتے ہیں:

" بدقسمتی سے انجمن نے اب تک ایک کتاب شائع کی یعنی گوتم بدھا۔" (مکاتیب جلد دوم ص ۲۳۰)

غرض اس سال یعنی ۱۹۰۴ء میں شبلی انجمن ترقیٔ اردو کی معتمدی سے مستعفی ہوگئے۔[1]

اس کے بعد اس کے سرپرست مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولوی عزیز مرزا صاحب رہے۔

مولوی عزیز مرزا صاحب کے زمانے میں انجمن ترقیٔ اردو کے جلسے نظام کلب میں ہوتے تھے۔ جیساکہ 'میری کہانی میری زبانی' میں مذکور ہے

" مولوی عزیز مرزا صاحب ضلع بیڑ کی تعلقداری سے دکن ہائی کورٹ کے جج مقرر کئے گئے اور وہ اس حیثیت سے حیدرآباد آئے، انھوں نے نظام کلب میں کئی جلسے انجمن ترقیٔ اردو سے متعلق کئے تھے۔" (ص ۳۰۲)

مولوی عزیز مرزا صاحب نے پلوٹارک کی کتاب کا ترجمہ تقریباً مکمل کر دیا تھا اور ویبسٹر انگلش ڈکشنری کو بنیاد قرار دے کر ایک انگریزی اردو لغت شائع کروانا بھی ان کے پیش نظر تھا۔

مولوی عزیز مرزا صاحب کے بعد مولوی عبدالحق اس کے کفیل ہوئے ۔ یہاں تک کہ اس کا مرکز دہلی قرار پایا۔

جیساکہ اس سے قبل بیان کیا گیا مولوی عزیز مرزا صاحب نے شبلی کو سررشتۂ علوم و فنون کا ناظم مقرر کیا تھا۔ بعد کو شبلی سازشوں کا شکار ہوگئے ۔ سررشتۂ علوم و فنون برخاست کر دیا گیا اور وہ لکھنؤ جاکر ندوہ

[1] مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۹

کا انتظام کرنے لگے ۔

مولوی عزیز مرزا صاحب پھر ہوم سیکرٹری کی خدمت پر فائز ہوئے تو اس زمانہ میں دارالعلوم حیدرآباد کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہوگیا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر اگھورناتھ نے علوم مشرقیہ کی تعلیم اور علوم مشرقیہ کے امتحانات کے لیے معیار العلوم کے قیام کی منظوری حاصل کرنے کے لیے محکمۂ سرکار میں درخواست دی تو مولوی عزیز مرزا صاحب نے بہ حیثیت معتمد تعلیمات ایک مشرقی یونیورسٹی کے قیام کی طرف سرکار نظام کو توجہ دلائی چناں چہ شبلی نے ایم مہدی حسن کے موسومہ خط میں جو ۳۔ جولائی ۱۹۰۲ء کا مورخہ ہے، یہ لکھا ہے:

" سرکار نظام علوم مشرقیہ کی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے ان کے نصاب وغیرہ کے لیے مجھ کو بلایا ہے۔ چند روز یہاں قیام رہے گا، یونیورسٹی کی نظامت مجھ کو دیتے ہیں مشاہرہ بھی معقول ہے لیکن اب کسی کے آگے کیا سر جھکاؤں"[1]

مذکورہ خط کے آخر میں یہ عبارت مندرج ہے:

حیدرآباد بذریعہ معتمد صاحب عدالت وکوتوالی

۳۔ جولائی ۱۹۰۲ء

اس سے ظاہر ہے کہ قیام یونیورسٹی کے سلسلہ میں شبلی ان دنوں حیدرآباد میں مقیم تھے ۔

اس وقت مولوی عزیز مرزا صاحب چوراہہ معظم جاہی مارکٹ کے اس نکڑ کے بنگلہ میں فروکش تھے جہاں آج کل دواخانہ ہے ۔

شبلی نے بجواب مراسلہ ناظم تعلیمات مورخہ ۳۔ ماہ الہی ۱۳۱۷ف نشان ۱۲۲۳ ایک رپورٹ مرتب کر کے حیدرآباد بھیجی اور یہ رپورٹ اسی زمانہ میں الندوہ میں بھی شائع کی گئی ہے[2]

اس رپورٹ پر غور کرنے کے لیے ۲۳۔ ماہ جنوری ۱۹۰۹ء کو ایک کمیٹی ہوئی ۔ اس کمیٹی میں

مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد تعلیمات و افسر تعلیمات، شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی، مولوی انوار اللہ صاحب

[1] مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۲۴۷

[2] الندوہ جلد ۶ نمبر ۲ ص ۹

استاد حضور نظام، سید ابوبکر شہاب یمنی، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر مددگار ناظم تعلیمات اور دیگر اصحاب شریک تھے۔"[1]

اس کمیٹی میں جو امور باقی رہ گئے تھے اس پر غور کرنے کے لیے ۱۷- فروری ۱۹۰۸ء کو ایک اور اجلاس ہوا، اس کے پریسیڈنٹ نواب فخرالملک وزیر عدالت تھے، اس اجلاس میں نواب عمادالملک اور ڈاکٹر سید سراج الحسن ناظم تعلیمات بھی بہ حیثیت رکن شریک تھے۔

ان کمیٹیوں سے متعلق شبلی نے یہ لکھا ہے:

"دونوں کمیٹیوں میں آزادی سے ہر پہلو پر بحث ہوئی اور کسی قدر تغیر و ترمیم کے ساتھ نصاب مرتبہ منظور ہوا۔"

نصاب منظور ہونے کے بعد کون کون سے امور محکمۂ سرکار کے پیش نظر تھے، خود شبلی سے سنئے:

"نصاب طے پانے کے بعد اس کے موافق دارالعلوم میں جدید اسٹاف قائم ہوگا، اس کے ساتھ ایک مجلس بطور سینیٹ کے قائم ہوگی اور اس کے لیے فیلوز منتخب ہوں گے، اس طرح ایک مشرقی یونیورسٹی قائم ہو جائے گی۔"

اس رپورٹ میں شبلی نے متعلقہ عہدہ داروں سے اس طرح توقع کا اظہار کیا ہے:

"نہایت مسرت کی بات ہے کہ اس وقت افسران تعلیم نواب فخرالملک بہادر وزیر عدالت، مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد تعلیمات اور سید سراج الحسن صاحب ناظم تعلیمات ہیں، اس طرح پورا امید ہے کہ یونیورسٹی عمدہ اور مستحکم اصول پر قائم ہوگی۔"

اب رہے اصول جن پر یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی، اس کی بھی شبلی نے وضاحت کی ہے۔

"نہ صرف انگریزی درسگاہوں کی تعلیم کافی ہے نہ قدیم مدرسوں کی۔ ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔"

یہ واقعہ ۱۹۰۹ء کا ہے، ۱۷ فروری ۱۹۰۹ء کو مشرقی یونیورسٹی سے متعلق آخری اجلاس ہوا اور ۱۹- اکتوبر ۱۹۰۹ء کو شبلی نے منشی

[1] الندوہ جلد ۵ نمبر ۲ ص ۱۶

محمد امین کے موسومہ خط میں یہ لکھا ہے:

"آپ کو معلوم ہے کہ مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے حیدرآباد سے نکلے تو ان کے مقربین بھی زد میں آئے ان میں مولوی عبدالحلیم شرر صاحب بھی ہیں۔"

(مکاتیب شبلی جلد اول ص ۲۴۷)

غرض اس سال مولوی عزیز مرزا صاحب حیدرآباد کی ملازمت سے کنارہ کش کر دیئے گئے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ہو گئے۔[1]

تاریخ ادب اردو (مؤلفہ رام بابو صاحب سکسینہ) میں شبلی کے حالات کے تحت یہ لکھا ہے:

"جب کہ مولوی عزیز مرزا صاحب کا دور دورہ تھا۔ مولانا نے حیدرآباد میں ایک مشرقی یونیورسٹی کھولنے کا اسکیم تیار کیا تھا۔"

"دور دورہ" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس زمانہ میں روح رواں مولوی عزیز مرزا صاحب ہی تھے۔"

جس طرح شبلی کو تعلیم سے خاص دلچسپی تھی اس طرح مولوی عزیز مرزا صاحب کو بھی تعلیمی امور میں انہماک تھا چنانچہ تاریخ ادب اردو میں آپ کے حالات میں لکھا ہے:

"یہ نہایت قابل تعریف بات ہے کہ وہ اپنے عہدہ کے اہم فرائض منصبی کی انجام دہی میں بھی اتنا وقت نکال لیتے تھے جس کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف اور مشاغل علمیہ میں صرف ہوتا تھا .... ان کو بھی علی گڑھ کالج کی ترقی بلکہ عام مسلمانوں کی ترقی و تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی"[2]

مولوی عبدالحق صاحب آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اردو نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ علمیہ کی رپورٹ بابت ۱۹۱۳ء میں مولوی عزیز مرزا صاحب سے متعلق یہ لکھا ہے:

"مولوی صاحب کی بے وقت موت سے تمام امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ان کے انتقال سے نہ صرف اس شعبہ کو بلکہ ساری

[1] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۴۴

[2] " " "

قوم اور ملک کو نقصان عظیم پہنچا اور اب تک یہ حال ہے کہ جب کبھی کسی قومی اور اہم ذمہ داری کی خدمت کے لیے کسی قابل سلیم الطبع با لغ نظر شخص کے انتخاب کی ضرورت ہوتی ہے تو ان کی یاد ہمارے دلوں کو صدمہ پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتی "۔[1]

حاصل یہ کہ مولوی عزیز مرزا صاحب بے وقت حیدرآباد دکن کی ملازمت سے کنارہ کش کر دئے گئے ورنہ مولوی شبلی ہی مشرقی یونیورسٹی کے صدر قرار پاتے۔

بعد کو شبلی ۱۹۱۳ء میں پھر حیدرآباد آئے تو ان کے منصب میں اور اضافہ ہوا۔ سید ابوظفر دسنوی کے نام مولوی شبلی کا ایک خط ہے اس کے آخر میں یہ الفاظ مندرج ہیں:

۳۰۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء حیدرآباد۔ کاچی گوڑہ (مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۹۲) آخری مرتبہ حیدرآباد آنے کے ایک سال بعد شبلی کا انتقال ہوگیا۔

[1] الناظر جلد ۱ نمبر ۵۵، ۵۶ ص ۶۸

ہماری کتابیں

بھارت کی لوک کتھائیں	قیمت ایک روپیہ
دیس بدیس کی لوک کتھائیں	۷۵ نئے پیسے
اچھا شہری	ایک روپیہ
کیلنڈر کی اصلاح	۵۰ نئے پیسے
ہندوستان کا دستور	ایک روپیہ
پنڈت نہرو سے بات چیت	دو روپے
ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے

نیشنل بک ٹرسٹ کی مطبوعات

کلچر یا تہذیب کا مستقبل	قیمت ۷۵ نئے پیسے
ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
سائنس کے چند پہلو	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
جوالا مکھی (ناول)	دو روپیہ ۲۵ نئے پیسے
ہندوستانی ڈراما	تین روپے ۷۵ نئے پیسے
دو شہروں کی کہانی (ناول)	۵ روپے

ڈاک خرچ کے لیے قیمت کا ۱۲½ فی صدی اور رجسٹری کے لیے ۵۵ نئے پیسے مزید بھیجئے۔ ۲۰ روپے یا زائد کی کتابیں منگوانے سے ڈاک خرچ نہیں لیا جاتا

کتابیں مندرجہ ذیل پتے سے طلب کی جا سکتی ہیں

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

نسلی امتیازات کے خاتمے کے لیے

اقوامِ متحدہ کی تجویز

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی ہے جس کا مقصد ہے کہ نسلی امتیازات کی تمام تر شکلوں کو بالکل ختم کر دیا جائے۔

اس تجویز میں کہا گیا ہے کہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اقوامِ متحدہ کا منشور تمام انسانوں کی یکساں عزت اور برابری کے اصول پر قائم ہے اور منجملہ دیگر باتوں کے اس کا مقصد نسل، جنس، زبان یا مذہب کی بنیاد پر کسی تفریق کو روا نہ رکھتے ہوئے تمام انسانوں کے لیے بنیادی آزادی اور انسانی حقوق کے حصول کے لیے بین الاقوامی تعاون حاصل کرنا ہے۔

اور یہ کہ "انسانی حقوق سے متعلق عالمی اعلان نامے میں کہا گیا ہے کہ ہر انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور اسے برابر عزت اور حقوق حاصل ہیں اور اس اعلانیے میں جن آزادیوں کا ذکر کیا گیا ہے ہر شخص بلا کسی تفریق خاص طور سے نسل، رنگ یا قومیت کی تفریق کے ان کا حق دار ہے۔

اور یہ کہ "نسلی تفریق یا تفوق و برتری کا نظریہ سائنسی لحاظ سے غلط، اخلاقی لحاظ سے قابلِ مذمت اور سماجی لحاظ سے غیر منصفانہ اور خطرناک ہے اور یہ کہ نظری یا عملی طور سے نسلی امتیاز کا کسی بھی طرح کوئی جواز نہیں ہے۔

اور یہ کہ بہت سے ملکوں میں ایسے اقدامات کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے اس میدان میں کچھ ترقی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود دنیا کے بعض حصوں میں نسل اور رنگ کی بنیاد پر کیے جانے والے امتیازات کی وجہ سے یہ مسئلہ تشویش کا باعث بنا ہوا ہے۔ اور بعض حکومتوں نے ایسے قوانین بنائے ہیں یا ایسے انتظامات کیے ہیں جس کی وجہ سے نسلی امتیازات کی حمایت اور ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کو اس بات کا یقین ہے کہ نسلی امتیازات کی تمام شکلیں خاص طور سے نسلی برتری یا نسلی بنیاد پر نفرت کی حکومت کی تشکیل شدہ پالیسیاں نہ صرف بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرتی ہیں بلکہ لوگوں میں دوستانہ تعلقات قائم ہونے اور قوموں میں اشتراک و تعاون پیدا کرنے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں اور بین اقوامی سلامتی اور امن کے لیے خطرہ ہیں۔

نسلی امتیاز سے صرف ان لوگوں کو نقصان نہیں پہونچتا جن کے ساتھ یہ امتیاز برتا جاتا ہے بلکہ ان لوگوں کو بھی پہونچتا ہے جو اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور یہ کہ ایک ایسا عالمی معاشرہ قائم کرنا جو تمام قسم کے نسلی امتیازات سے پاک ہو، اقوامِ متحدہ کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

لہٰذا نسلی امتیازات کی تمام شکلوں کو دنیا سے جلد سے جلد ختم کرنے اور انسانی وقار کا احساس پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے خاتمے کے لیے قومی اور بین اقوامی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

لہٰذا مندرجہ بالا امور کے پیشِ نظر یہ اعلان کیا جاتا ہے:

نسل و رنگ کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق انسانی وقار کے خلاف

جرم ہے اور اقوام متحدہ کے منشور کے اصولوں کی خلاف ورزی سمجھ کر اس کی مذمت کی جانی چاہیئے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے قوموں کے درمیان دوستانہ اور پُرامن تعلقات میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور امن و سلامتی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

کوئی ریاست، ادارہ، جماعت یا فرد انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے معاملے میں لوگوں، جماعتوں یا اداروں کے ساتھ نسل، رنگ کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتے گا۔ اور نہ ہی کوئی ریاست پولیس یا کسی اور ذریعے سے نسلی امتیاز کی ہمت افزائی یا حمایت کرے گی۔ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے ٹھوس اقدامات کئے جائیں گے کہ کسی خاص نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد انسانی حقوق اور بنیادی آزادی سے مستفید ہو سکیں۔

شہری حقوق، شہریت، تعلیم، مذہب، روزگار، پیشہ اور رہائش کے معاملے میں خاص طور سے کوششیں کی جائیں کہ نسل و رنگ کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔

تمام ریاستوں کو ایسے قدم اُٹھانے چاہئیں جس سے ایسے تمام قوانین اور ضابطے منسوخ ہو جائیں جو نسلی امتیاز پیدا کرتے اور اسے برقرار رکھتے ہوں۔

ملک کے سیاسی اور شہری حقوق کے حدود میں نسل و رنگ کے امتیاز کو بالکل حائل نہیں ہونا چاہیئے۔ خاص طور سے ووٹ دینے یا حکومت میں حصہ لینے کے معاملے میں اس بنیاد پر امتیاز نہیں کیا جانا چاہیئے۔ ہر شخص کو اپنے ملک کی سرکاری نوکریوں میں جگہ پانے کا یکساں حق حاصل ہے۔

ہر شخص قانون کی نظروں میں برابر ہے اور قانون کے تحت انصاف پانے کا یکساں حقدار ہے۔ حکومت کو اس کے جان و مال کی پوری پوری حفاظت کرنی چاہیئے۔

تعلیم اور اطلاعات کے ذریعے فوراً ہی ایسے مؤثر اقدامات کئے جائیں جس سے نسلی امتیاز کا خاتمہ ہو۔ قوموں میں سمجھ داری، رواداری اور دوستی پیدا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ اقوام متحدہ کے منشور کے اصول اور مقاصد، انسانی حقوق کے عالمی اعلانیے اور نوآبادیات کو آزادی دینے کے متعلق اعلان نامے کی بھی تشہیر کی جائے۔

ایسے تمام پروپیگنڈے کی سختی سے مذمت کی جائے جو نسلی برتری یا تفوق کے خیالات یا نظریے کی تائید یا ہمت افزائی کے لیے ہو۔

دوسرے رنگ و نسل کے فرد یا جماعت کے خلاف تشدد استعمال کرنے کے لیے اکسانے کو سماج کے خلاف جرم سمجھا جائے اور قانون کے تحت سزا دی جائے۔

اس اعلان نامے کو مؤثر طور سے بروئے کار لانے کے لیے تمام ریاستوں کو ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جس سے رنگ و نسل کی بنیاد پر نسلی امتیاز کو ترقی دینے والی تنظیمیں خلافِ قانون قرار دی جائیں۔

اقوام متحدہ، اس کی خاص ایجنسیاں، حکومتیں اور غیر سرکاری تنظیمیں ہر ایسی کوشش کریں جو اُن کے امکان میں ہے جس سے نسلی امتیاز کی تمام شکلوں کا خاتمہ ممکن ہو جائے۔ وہ نسلی امتیاز کے وجوہ کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیں تاکہ اس کے انسداد کے لیے مؤثر اور مناسب کارروائی کی جا سکے۔

ہر ریاست کو اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں اور موجودہ اعلانیے، نوآبادیات کو آزادی دینے کے اعلان اور انسانی حقوق سے متعلق عالمی اعلان نامے پر پوری طرح اور ایمان داری کے ساتھ عمل کرنا چاہیئے۔

پُرامن اور صحت مند معاشرہ کے لیے

قومی یک جہتی ضروری ہے

ہندوستانی ریلوں کی ترقی
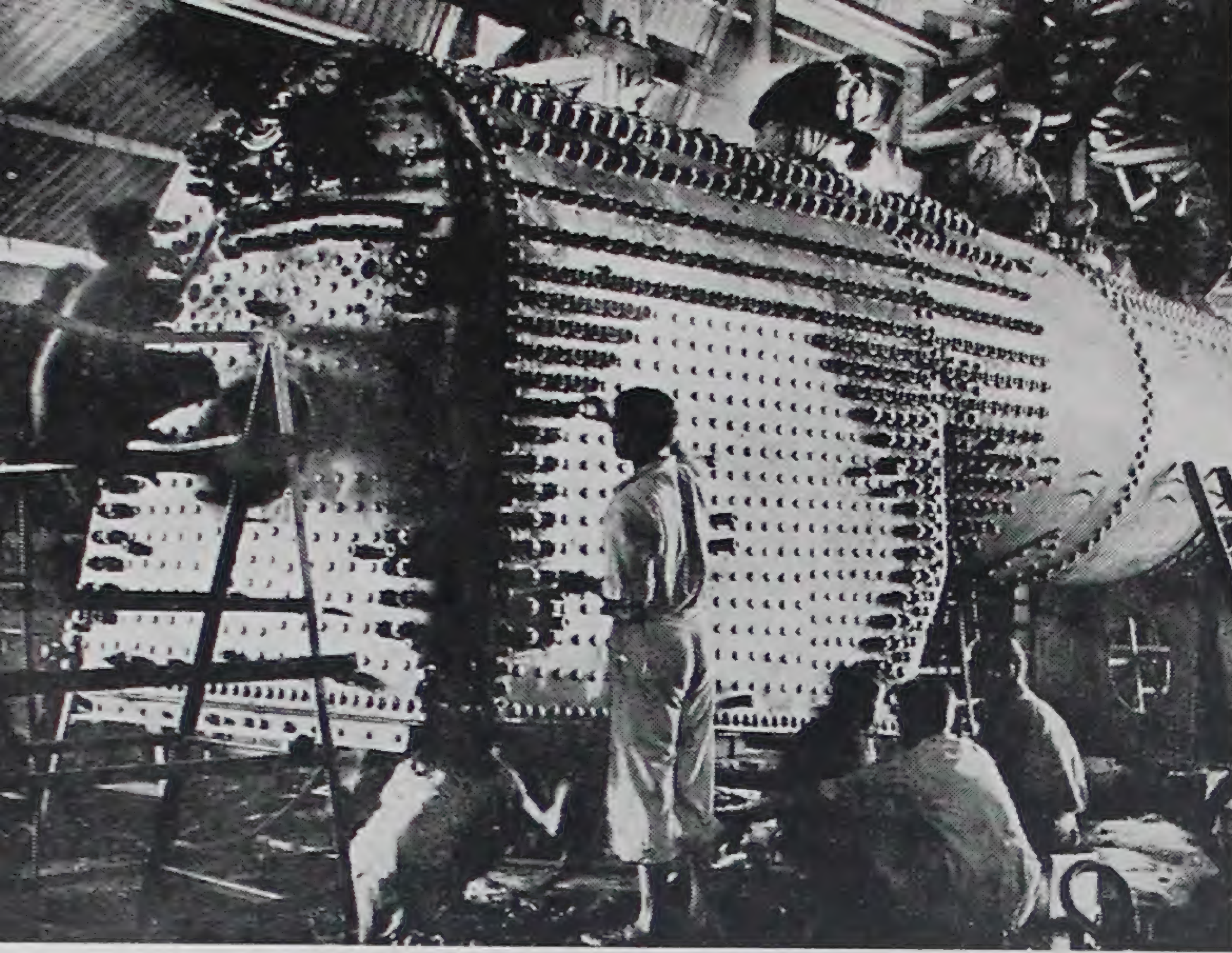
چترنجن میں ریل کے انجن بنانے والے
کارخانے میں کاریگر ایک بوائلر
کی ساخت کی تکمیل کر رہے ہیں

چرک (اتر پردیش) اور گڑھوا روڈ (بہار)
درمیان نئی ریلوے لائن جو ۱۶۵ کلو میٹر لمبی ہے
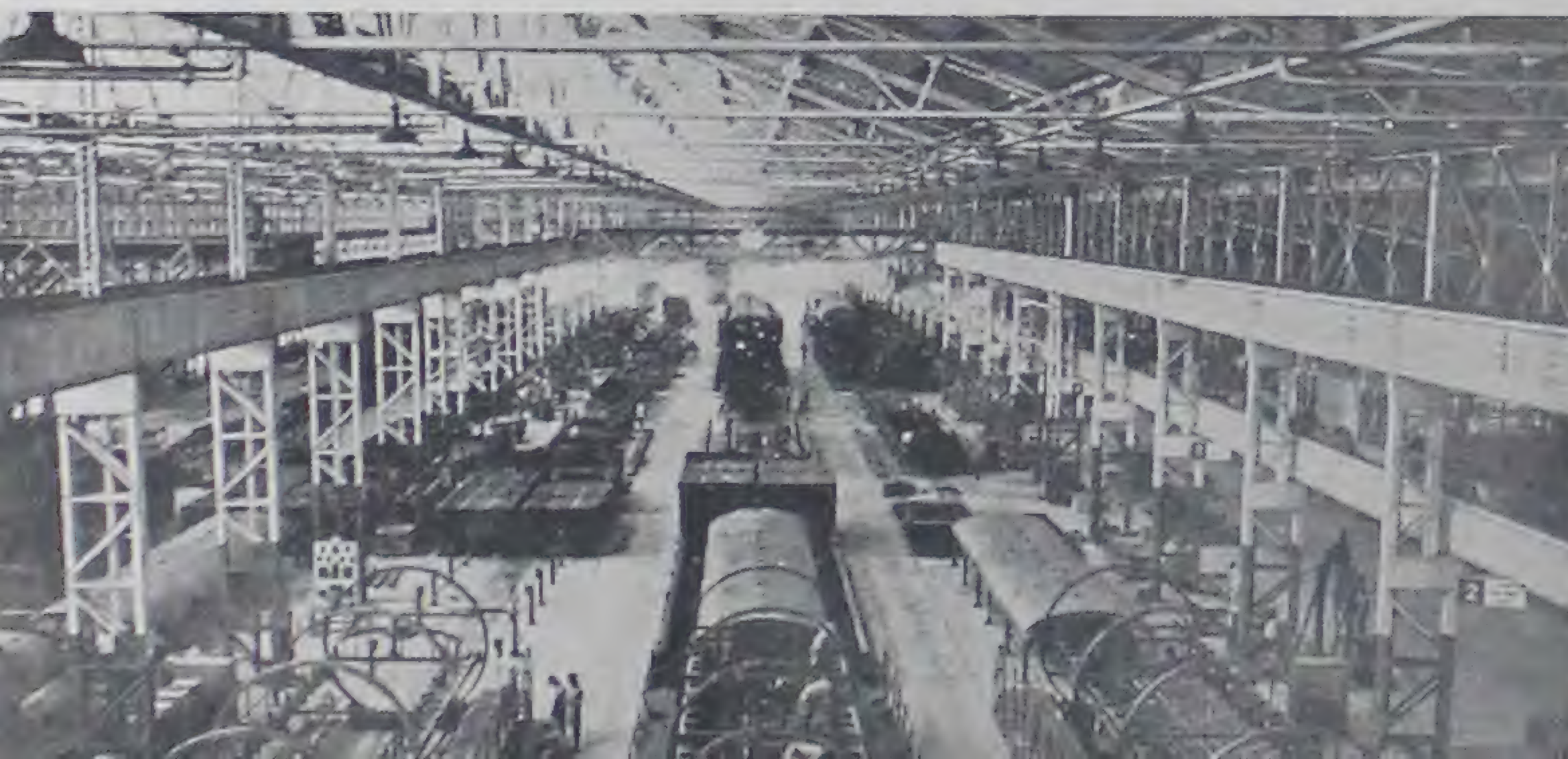
پیرامبور مدراس میں ریل گاڑی
کے ڈبے بنانے کا کارخانہ

گرمی کا موسم

پنہارنیں
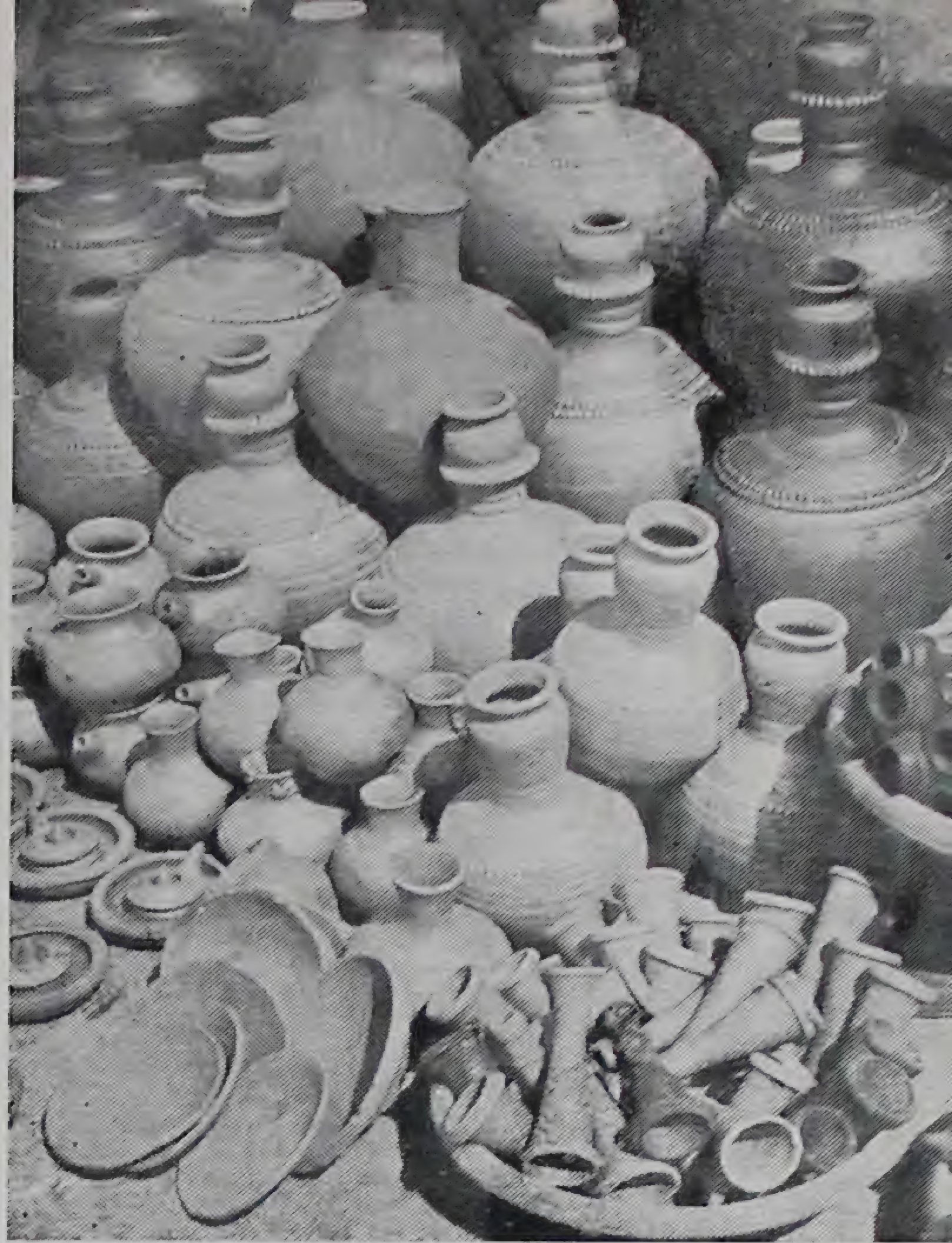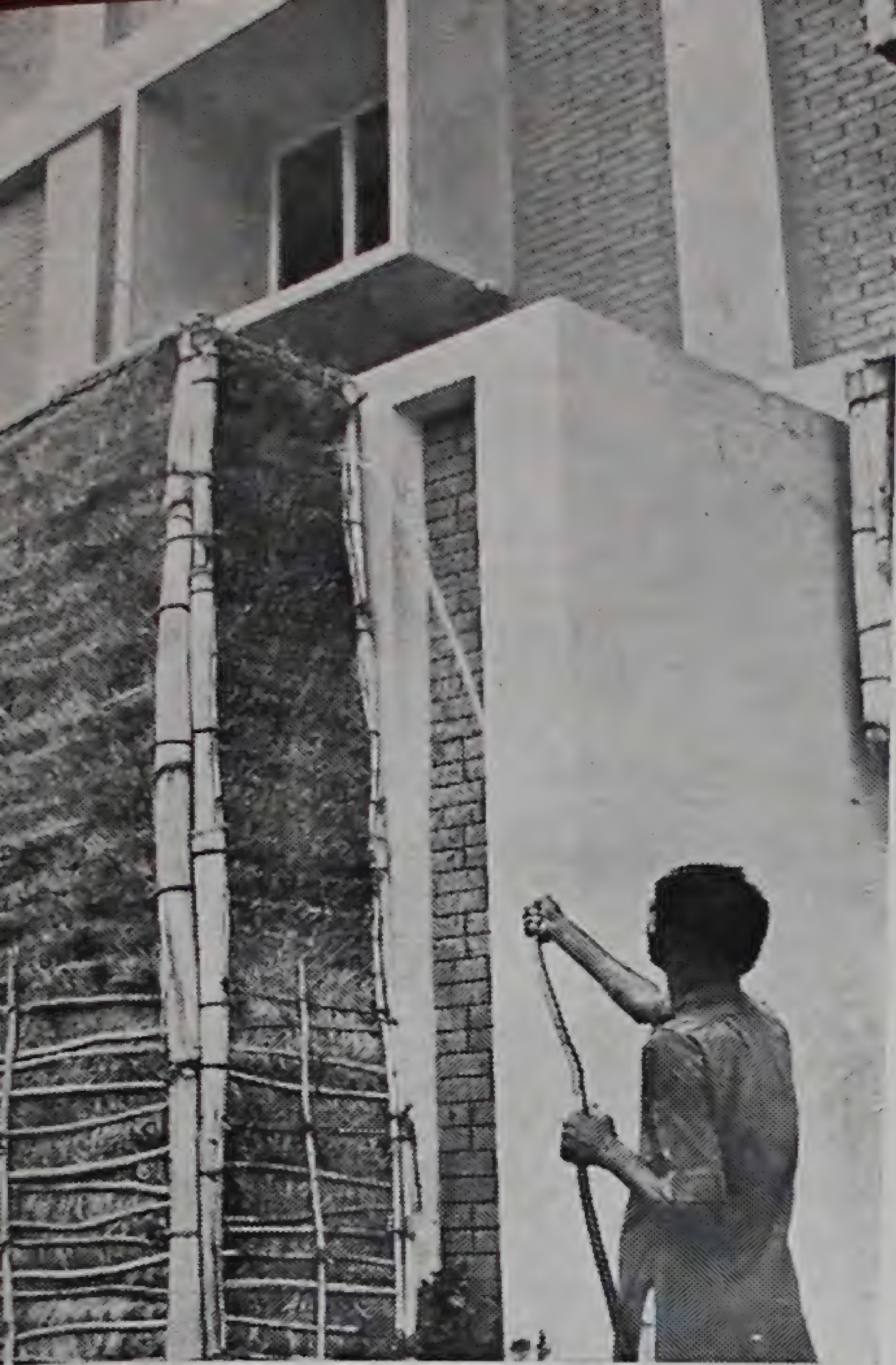
غزل

آپ مستقبل سے رشتہ جوڑیئے — مجھ کو میرے حال پر اب چھوڑیئے

روشنی میں مجھ کو کیوں لاتے ہیں آپ — اپنا رُخ میری طرف سے موڑیئے

آپ کو دنیا نہ کچھ کہنے لگے — اپنے دیوانے کا دامن چھوڑیئے

آپ مختارِ زمانہ ہی سہی — کیوں کسی مجبور کا دل توڑیئے

زندگی ہے ایک ٹوٹا سلسلہ — جوڑ سکتے ہوں تو آکر جوڑیئے

کون طے کرتا ہے کتنا راستہ — فیصلہ اب فاصلے پر چھوڑیئے

آپ کے ہم، ساری دنیا آپ کی — سب جب اپنے ہیں تو کس کو چھوڑیئے

میرا دل ہے مندر و مسجد نہیں — کم سے کم اس کو سمجھ کر توڑیئے

زندگی تا عمر رہنے پر اٹل — جسم کی یہ ضد کہ اب گھر چھوڑیئے

آزماتے جائیے قسمت نذیر

سنگِ در کوئی ملے سر پھوڑیئے

کرتار سنگھ دُگل

عورت اور انتظار

میری عادت ہے سڑک پر میں آنکھیں نیچے کیے ہوئے چلتا ہوں۔
اس دن پتہ نہیں کیا ہوا، پل پار کونے والے گھر سے گزرتے ہوئے میری نظر سامنے گیٹ پر جا پڑی۔ گیٹ میں سے تین پہیوں والی سائیکل چلاتا ایک بچہ نکلا۔ نیلی آنکھیں، سنہرے بال۔ بچہ باہر نکلا اور کوئی ہاتھ آگے بڑھ کر گیٹ بند کرنے لگے۔ اور گیٹ ویسے کا ویسا کھلا رہ گیا۔ ہنستی ہوئی انکھیاں کھلتی ہوئی مسکان، دانت، موتیوں کے دانے۔ ہلکے ہلکے سُرخ ہونٹ یوں کھلے جیسے ایک لمحہ رک جانے کو کہہ رہے ہوں۔

اچانک میری نظریں دھرتی پہ جا ٹکیں اور میں اپنی چال چلتا آگے نکل گیا۔ سامنے کا موڑ اور پھر کچہری، جہاں میں سارا دن بیٹھا لوگوں کے مقدمے سنتا ہوں۔

ہر روز صبح میں وقت پر گھر سے چلتا ہوں، کچہری کھلنے سے پانچ منٹ پہلے اپنے کام پہ پہنچ جاتا ہوں۔ شام کو لوٹتے ہوئے چاہے دیر ہو جائے پر سویرے میرے پہنچنے میں جہاں تک ممکن ہوتا ہے کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہر روز میں اپنی آنکھیں نیچے کیے ہوئے اس کونے والے گھر کے پاس سے ویسے ہی گزر جاتا، جیسے سڑک کے اور گھروں کے پاس سے۔

اکثر اُس گھر کی چار دیواری پر کپڑے سکھانے کے لیے ڈالے ہوتے۔ میں حیران ہوتا کیسے وہ لوگ صبح صبح کپڑے دھو لیتے ہیں۔ شلواریں تنگ موہری والے پائنچے، خوشبوؤں سے بھرے ہوئے رومال۔ ایک دن یونہی اپنے خیالات میں محو جا رہا تھا کہ میں نے دیکھا میرے قدموں میں دودھ سی سفید انگیا آن پڑی۔ آپ ہی آپ میرے قدم رک گئے۔ جھک کر میں نے چاہا کہ انگیا کو اٹھا کر چار دیواری پر رکھ دوں، کہ میرا ہاتھ جیسے کانپنے لگا۔ مجھے جھجک سی محسوس ہوئی۔ انگیا کو ویسا کا ویسا وہیں پڑا چھوڑ کر میں تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔

اس دن کچہری میں اپنا کام کرتے ہوئے مجھے کئی بار اس انگیا کا خیال آیا جیسے چاندی رنگے کبوتروں کا جوڑا پاس پاس سمٹا پڑا ہو اور میں سوچنے لگتا پتہ نہیں گھر والوں نے انگیا کو سنبھال لیا ہوگا کہ نہیں۔

کئی دنوں سے میرے پاس ایک عجیب مقدمہ آیا ہوا تھا۔ ایک بے حد خوبصورت بنگالی جوڑا طلاق مانگ رہا تھا۔ لڑکا نوجوان تھا، خوبرو تھا اور بے حد امیر۔ پڑھا لکھا، سلجھا ہوا، سلیقے والا۔ لڑکی جیسے پری ہو دیکھ دیکھ کر پیاس نہ مٹتی۔ گوری چٹی جیسے سنگ مرمر کے مجسمے میں کسی نے جان پھونک دی ہو۔ بے پناہ جوانی۔ میں نے لڑکے کو الگ بلا کر پوچھا۔ "آخر اس لڑکی میں کیا کمی ہے کہ تم طلاق لینا چاہتے ہو؟" وہ لڑکی میں کوئی نقص نہیں بتا سکا۔ میں نے لڑکی کو الگ بلا کر پوچھا۔ "لڑکے میں کیا خرابی ہے کہ تمھاری آپس میں نہیں بن رہی؟" وہ بھی لڑکے میں کوئی خرابی نہیں بتا سکی۔ پھر وہ کیوں ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے؟ لڑکے کو اس کا پتہ نہیں تھا، لڑکی کو اس کا پتہ نہیں تھا۔ ان کے اپنے عزیز، احباب سب ان کو سمجھا چکے تھے لیکن انھوں نے کسی کی نہیں سنی تھی اور اب وہ میری نصیحت پر کان نہیں دھر رہے تھے۔ صرف کسی کا حسین ہونا، کسی کا بے قصور ہونا کافی نہیں کہ کوئی اچھی بیوی بھی ہو سکے۔ صرف کسی کا امیر ہونا، نوجوان ہونا اُسے اچھا

شوہر نہیں بنا دیتا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا — "تم اس لڑکے کو چھوڑ دوگی تو دس لڑکیاں اسے بیاہنے کے لیے تیار ہوں گی۔" لڑکی کو اس کا علم تھا۔ میں نے اس لڑکے سے کہا۔ "تم اس لڑکی سے الگ ہو گے تو سینکڑوں لڑکے اسے بیاہنے کے لیے بے قرار ہوں گے۔" لڑکے کو اس کا پتہ تھا۔ لیکن میاں بیوی اب ایک دن بھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔

اپنے خیالوں میں اُلجھا اس شام میں کچہری سے لوٹ رہا تھا۔ آسمان پہ بادل تیر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہر پیڑ پتوں اور پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ ایک بھینی بھینی خوشبو آس پاس چھائی ہوئی تھی۔ اپنے خیالات میں گم میں کونے والے اس مکان کے پاس پہنچا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور چار دیواری کے اس طرف کھلے موتیا کی کلیاں میرے سامنے سڑک پر آکر بچھ گئیں جیسے کسی نے پھولوں کی مہین چادر کسی کی راہ میں بچھا دی ہو۔ ایک نشے میں میرے قدم ڈگمگا گئے۔ اس رات اور اس کے بعد کئی اور راتیں سونے کے لیے لیٹا۔ مجھے موتیا کی کلیوں کا اس طرح اچانک سڑک پر آکر بچھ جانا یاد آجاتا اور میں کتنی کتنی دیر اداس اداس سا پڑا رہتا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ گرمی زیادہ ہوتی اور آندھی چلنے لگتی۔ طوفان اُتر آتا۔ کئی بار سارا سارا دن اور ساری ساری رات جھکڑ چلتا رہتا۔ پیڑ ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے۔ کئی جڑ سے اُکھڑ جاتے اور ٹہنیاں ٹوٹ کر کہیں کی کہیں جا پڑتیں۔ کونے والے اُس گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے میں کئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا، آج کل آندھی جھکڑ والے دنوں، جیسے پھاڑے ہوئے خطوط کے ٹکڑے باہر سڑک پر بکھرے ہوئے ہوں۔ کاغذ کے بے شمار ٹکڑے، پُرزہ پرزہ کیے ہوئے، ہر روز آندھی اُٹھا کر جیسے سڑک پر بکھیر دیتی اور میں حیران ہوتا، اس گھر میں کوئی کتنی چٹھیاں لکھتا تھا۔

چٹھیوں کے پُرزے ہی تو تھے۔ میرا قیاس غلط نہیں تھا۔ پھر میں نے دیکھا، کونے والے اس گھر کے باہر سڑک پر ایک کورا لفافہ پڑا تھا۔ کورے لفافے کے پاس ایک کورا کاغذ تھا۔ پانی کے قطروں سے بھیگا بھیگا۔ جیسے ٹپ ٹپ کسی کے آنسو ڈھلک پڑے ہوں۔ دفتر میں اُس دن بجلی فیل ہو گئی اور بار بار میرا پسینہ بہہ بہہ کر میرے سامنے پڑی مسل پر آن پڑتا جیسے کسی کے آنسو پھوٹ پھوٹ پڑیں۔

یونہی اپنے خیالات میں گم ایک دن کونے والے اس گھر کے سامنے سے میں گزر رہا تھا کہ اندر سے ریڈیو کی آواز آئی۔ "ماہیا" کا کوئی بول تھا۔

اس کے آگے ایک ڈھابا تھا۔ وہاں پر ریڈیو پر یہی گانا تھا۔

اس کے آگے ریڈیو کی دکان تھی، وہاں بھی یہی گانا تھا۔

اس شام کام سے لوٹتے ہوئے، پھر وہی نغمہ سنائی دے رہا تھا، بچوں کے پارک میں، بس کے اڈے پر، ریڈیو کی دکان پر، چائے کے ہوٹل میں، پان والے کی دکان پہ، گھر پہنچنے تک 'ماہیا' کے بول میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ پھر رات کو سونے سے پہلے وہی نغمہ دُور کہیں لاؤڈ اسپیکر پہ سُنایا جا رہا تھا۔ شادی کا گھر تھا شاید۔ بار بار وہی 'ماہیا' کے بول۔ اور اچانک میں اداس ہو گیا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس رات بڑے زور کا جھکڑ آیا۔ بارش آندھی اور بادل۔ ساری رات مُوسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ اگلی صبح ہم نے دیکھا۔ سامنے نالے کا پُل بہ گیا تھا۔ بستی کے ہم سب لوگ پریشان ہو گئے۔ دوسرے راستے سے سڑک پہ پہنچنے کے لیے دو فرلانگ کا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔

پُل کو تو بنتے بنتے ہی بننا تھا۔ ہم بستی کے رہنے والے ایک دن دو دن خفا ہوئے۔ پھر ہم نے دوسری راہ چلنا شروع کر دیا۔ پھر بھی پُل کے بن جانے کا انتظار ہمیں لگا رہتا۔ چھوٹے چھوٹے بچے، سامنے دکھائی دے رہی سڑک پر، اتنا لمبا چکر کاٹ کر پہونچتے تھے۔ ایک سال، دو سال، تین سال، کئی سال بیت گیے نالے کا پل نہ بن سکا۔ نالے کے ایک جانب کمیٹی کی حد تھی اور دوسری طرف بورڈ کی۔ کمیٹی والے کہتے — چھاؤنی والوں کو پُل بنانا چاہیئے۔ چھاؤنی والے کہتے — کمیٹی والوں کو بنانا چاہیئے، پچھلی بار وہ بنا چکے تھے۔ کمیٹی والے کہتے، کیونکہ پچھلی بار چھاؤنی والوں نے پُل بنایا تھا لہٰذا اس بار بھی انھیں کو بنانا چاہیئے۔ آخر یہ مقدمہ میرے پاس آیا۔ کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ دیوانی کے اس معاملے میں کئی سال اور بیت گئے۔

بستی کے لوگ سڑک کا نزدیکی راستہ بھول بھی گئے تھے کہ پُل پھر

ہو گیا۔

اس صبح آسمان اُجلا اُجلا تھا۔ آس پاس دُھلا دُھلا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری۔ مینا کا ایک جوڑا، کبھی ہماری منڈیر پہ آ بیٹھتا کبھی نیچے آنگن میں اُتر آتا۔ ایک فاختہ سامنے امرائی میں میٹھی پکار رہی تھی۔ دور مندر میں مسلسل گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

اخبار والے کی سائیکل نے آج ہر روز کی طرح شور نہیں مچایا، نہ ہی اس نے اخباروں کے پلندے کو یوں پھینکا جیسے وہ ہر روز پھینکتا تھا۔ دودھ والے نے اپنے بھونپو کی آواز نہیں کی۔ ہر طرف ایک سکون سا تھا۔ ننھے بچے پُل پر پیچھے کھیلتے کھیلتے اس پار چلے جاتے، کبھی اس پار آ جاتے۔ کبھی پُل پر کھڑے ہو کر نیچے بہ رہے گندے پانی میں تھوکنے کی مشق کرنے لگتے۔

اور میں ہمیشہ کی طرح آنکھیں نیچی کئے۔ اپنے پُرانے راستے کام پر جا رہا تھا کہ پتہ نہیں کیا ہوا۔ پُل پار کرنے والے اس گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے میری نظر سامنے گیٹ پر جا پڑی۔ گیٹ میں سے دو پہیوں والی سائیکل پکڑے ایک لڑکا نکلا۔ نیلی آنکھیں، سنہرے بال۔ لڑکا باہر نکلا اور کوئی ہاتھ آگے بڑھ کر گیٹ بند کرنے لگے اور گیٹ ویسے کا ویسا کھلا رہ گیا۔ ہنستی ہوئی آنکھیں، کھلتی ہوئی مسکان دانت موتیوں کے دانے، ہلکے ہلکے سُرخ ہونٹ، جیسے ایک لمحہ رک جانے کو کہہ رہے ہوں۔

اچانک میری نظریں دھرتی پر جا ٹکیں اور میں اپنی چال چلتا آگے نکل گیا۔ سامنے کا موڑ اور پھر کچہری، جہاں میں سارا دن بیٹھا لوگوں کے مقدمے سنتا ہوں، اور اپنی سمجھ کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں۔

جلیل ساز

غزل

جستجوئے حیات میں گم ہے — آدمی اپنی ذات میں گم ہے

ہر صدائے شکستِ ساغرِ دل — شورشِ کائنات میں گم ہے

رونقِ زندگی جنوں سے ہے — عقل، کارِ نجات میں گم ہے

یادِ زلفِ بتاں میں محو ہے دل — جیسے خورشید رات میں گم ہے

"فرصتِ کاروبارِ شوق کسے" — زندگی حادثات میں گم ہے

ہو سکے تو تلاش کر دیجے — دل مرا کائنات میں گم ہے

سادگی اور خلوص کو تج کر

ساز انسان گھات میں گم ہے

ظ انصاری

بَیلے کا تعارف

(گزشتہ سے پیوستہ)

بَیلے اور ادبیات

کوئی رازِ دل، کوئی نازک سے نازک خیال، اور حسن کا کوئی منظر کاغذ کے اسٹیج پر آئے بغیر نہیں رہتا، اسی کا کچھ حصّہ ہم بعد میں ادبیات کی فہرست میں شمار کر لیتے ہیں۔ بَیلے کے بارے میں بھی خیال ہوتا ہے کہ وہ پہلے ادبی صورت میں ہوتا ہوگا۔ لیکن ایسا ہے نہیں۔ اگرچہ بعض مشہور ادب پاروں کو بیلے کا روپ دیا گیا ہے، مگر ایسے بھی کئی کامیاب بیلے ہیں جن کا نہ پہلے کوئی ادبی وجود تھا، نہ اب ہے۔ مثلاً فرانسیسی تخیل کی پیداوار Les Sylphides جو دنیا بھر کے بیلے کمپنیوں میں تقریباً پچاس سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ دکھایا جا رہا ہے۔ اس کے برخلاف کانن ڈائل کی مشہور تصنیف اور کردار شرلاک ہومز بیلے کی صورت میں آ کر ناکام ہو گیا (جو ادبی صورت میں انگریزی کی مقبول ترین کتابوں میں شمار ہوتا ہے) چائیکوفسکی کے شہرۂ آفاق بیلے ہنسوں کی جھیل" "مرتا ہوا ہنس" اور "سوتی ہوئی حسینہ" کو (جو ہندوستان میں بھی دکھائے جا چکے ہیں) کسی ادبی کتاب یا مصنّف سے نہیں لیا گیا۔ اور آج بھی اگر ان کی کہانی لکھی جائے تو افسانوی ادب میں جگہ نہیں پائے گی۔

ادب اور بیلے کا تعلق اس شاعرانہ خیال کا یا نغماتی ڈرامے کا تعلق ہے جو ادبی بیان کا محتاج نہیں ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ شاعر کو ایک خیال سوجھا، یا نغمہ نگار یا کوریوگرافر یا آرٹسٹ نے کہیں سے کوئی ایسا افسانہ، نظم، ڈرامائی واقعہ یا محض خیالی داستان سُن سُنالی جس کو قوتِ تخیّل نے رقص و موسیقی کے لباس میں ابھرتا ہوا دیکھ لیا، پھر اسی سے بیلے بن گیا۔

یہاں ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے دو مثالیں ضروری ہوں گی:

Giselle (یا فرانسیسی اور روسی زبانوں میں ژیزل) دو ایکٹ کا ایسا بَیلے ہے جسے پچھلے ایک سو بیس سال سے پہلو بدل بدل کر دنیا کے اسٹیج پر پیش کیا جا رہا ہے۔ جرمنی شاعر ہائنے کے یہاں سے اس کا خیال ملا۔ اور خیال کا اصل نکتہ یہ ہے کہ وہ لڑکیاں جو شادی کی تیاری کرتے کرتے دنیا سے سدھار جاتی ہیں، وہ رات گئے اپنی قبروں سے نکل آتی ہیں اور پُرسکون فضا میں ناچنے لگتی ہیں۔ لڑکپن کی شوخیاں، کنوارپن کی بے فکری اور نوجوانی کی بے خطر مسرتیں ان کو اس تھوڑی سی مدّت کے لیے پھر مل جاتی ہیں اور ان کی قدرتی خواہش ہوتی ہے کہ فرصت کے یہ شیریں لمحے موت کے گھنگھور سنّاٹے کو دُور ہٹا دیں۔ اگر ایسے میں کوئی راہ گیر ادھر سے گزر جائے تو یہ لڑکیاں جوشِ مسرّت میں اور اپنی نامراد جوانی کا انتقام لینے کے لیے اسے بھی کھیل تماشے میں کھینچ لیتی ہیں۔ اسے ناچ کے حلقوں میں اتنے چکر کاٹنے پڑتے ہیں، اتنی فرمائشوں کی تعمیل کرنی پڑتی ہے کہ وہ ادھ موا ہو کر گر جاتا ہے اور ایسا گرتا ہے کہ پھر نہیں اُٹھتا۔

انیسویں صدی کے شروع میں یہ خیال اپنے وقت کے مشہور کوریوگرافر کورالی کو سوجھا کہ اس پر بیلے تیار کیا جائے ۔ ۱۸۴۱ء میں بیلے تیار ہوا پیرس میں منظر عام پر آیا اور پہلی کوشش ہی اتنی کامیاب رہی کہ دنیا بھر کے بیلے سنے اسے اپنایا۔[1] ۱۹۴۴ء سے روس کے تاریخی اسٹیج 'بالشوئی' سے پیش کیا جارہا ہے ۔ اور ایک کے بعد ایک کوریوگرافر اس میں ایکشن اور موسیقی کی تبدیلیاں کرتا رہا ہے ۔ سوا سو برس پہلے جب اسے پیرس میں پیش کیا گیا تھا تو وہ ایک ورغلائی ہوئی لڑکی کی داستانِ عشق کا میلو ڈراما معلوم ہوتا تھا جس میں یہ لڑکیاں اپنے چاہنے والوں سے انتقام لیتی ہیں ۔ رفتہ رفتہ موسیقی کی ترتیب ، سازوں کی تبدیلی اور ٹیمپو کی کمی بیشی نے افسانے کے دوسرے پہلو کو، بیلے کے دوسرے ایکٹ کو حاوی کر دیا ۔ اب اس کا تاثر ہے ، محبت کا انتقام موت سے ۔ محبت یہاں فاتح عالم نظر آتی ہے ، عاشق یہاں عاشقِ صادق ہے ۔ لڑکیوں کی رقص کرتی ہوئی آتما انتقام نہیں لیتی بلکہ اہلِ دل سے انصاف طلب ہے اور منصف ہے ان لوگوں کے حق میں جو دو دلوں کی خوشی نہیں دیکھ سکتے اور فریب ، اتہام اور مکاری کی حرکتوں سے کھنڈت ڈالتے ہیں ۔ " ژیزل " بیلے کا پہلا ایکٹ یوں دکھایا گیا ہے :

پردہ سرکتا ہے تو ایک چھوٹا سا گاؤں اسٹیج کے اس پار سے نظر آتا ہے ۔ سیدھے سادے لوگ ، سیدھی بے ریا زندگی ۔ صبح کی نرم دھوپ پھیلی ہوئی ہے ۔ چڑیاں چہچہا رہی ہیں ۔ نیلے آسمان کا شامیانہ تنا ہے ۔ ایک بھولی بھالی لڑکی " ژیزل " گھر سے باہر آتی ہے ، اس منظر کے نشے میں گم ہے اور اس سے زیادہ نشہ ہے پہلی محبت کی پاکبازی کا ، جو آتشِ سیال کی طرح رگوں سے پھوٹی پڑتی ہے ۔

گاؤں کا ایک اور شخص جنگل کا رکھوالا جو ژیزل سے محبت کرتا ہے طرح طرح کے حیلوں سے اُسے یقین دلاتا ہے کہ البرٹ جس کی محبت میں تم سرشار ہو ، وہ دھوکہ دے رہا ہے ۔ وہ تو کسان کے بہروپ میں ایک امیر کبیر آدمی ہے جو شکار کے لیے ادھر آنکلا ہے ۔ آج سے کل چل دے گا ۔ کسی بہانے وہ اس مکان میں آجاتا ہے جہاں گاؤں کے اندر البرٹ ٹھیرا ہوا ہے ، یہاں اُسے سرکاری نشان والی ایک تلوار نظر آتی ہے اور اس طرح ایک ثبوت بھی مل جاتا ہے ۔

کہیں سے صاحب حیثیت شکاریوں کا ایک گروہ ادھر آنکلتا ہے ۔ انھیں میں وہ لڑکی بھی ہے ' باتیلدا " جس سے البرٹ کی منگنی ہو چکی ہے ، لیکن البرٹ تو ژیزل سے محبت کی پینگیں بڑھا چکا تھا ۔ وہ ان شکاریوں سے اپنے تعلقات کو دیہات والوں کی نظر سے چھپانا چاہتا ہے ، خود بھی منہ چھپائے پھرتا ہے ۔ آخر میں وہ جنگل کا رکھوالا البرٹ کی تلوار دکھا کر سارا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے اور البرٹ دھوکے باز ثابت ہوتا ہے ۔

' ژیزل ' سادہ دل اور پُر شوق ، پُر اعتماد لڑکی اس غم کی تاب نہ لا سکی ۔ زندگی کا پہلا فریب ہر اعتماد اور اعتقاد کو کچل گیا ۔ زندگی تیرہ و تار ہو گئی ۔ وہ دیوانی ہو کر نکل گئی اور اسی حالت میں جان سے گئی ۔

دوسرا ایکٹ

رات کا وقت ، چاندنی چھٹکی ہوئی ، گاؤں کا سنسان قبرستان ، دور دھندلکے سے لڑکیوں کی روحیں ، گویا تیرتی ہوئی آرہی ہیں ۔ خود ہائنے کے لفظوں میں " جسم پر عروسی کے جھلکتے ہوئے لباس تھے ، سر پر بیاہ کے سہرے " ۔ چاندنی کے منظر میں یہ حسینائیں بے خودی سے ناچنا شروع کرتی ہیں ۔ جتنا انھیں دبدھا ملتی ہے کہ یہ وقتِ عزیز ، یہ لمحۂ غنیمت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے ، اور اس کے گزر جاتے ہی پھر وہی برف سی ٹھنڈی قبر ہوگی ، پھر وہی مٹی کا بچھونا ہوگا ، اتنا ہی اور تیزی سے ، اور سرمستی سے ناچنے لگتی ہیں ۔

جنگل کے رکھوالے کے ضمیر پر بوجھ تو تھا ہی ، وہ ژیزل کی قبر کی طرف آنکلا ۔ ان بے قرار روحوں کی نظر اس پر پڑی ۔ اپنی بے درد نگران ' میرتا ' کے حکم پر سب اس کی طرف دوڑ پڑیں اور اسے ناچ میں چکر دینے شروع کیے ۔ یہاں تک کہ وہ تھک کا کر گر پڑا اور ٹھنڈا ہو گیا ۔

[1] اس بیلے کا جو پروگرام والا کتابچہ میرے پاس ہے اس میں اور روسی انسائیکلو پیڈیا میں نغمہ نگار کا نام جا بجا 'آدن' لکھا ہے ، جب کہ انگریز ناقد اور 'بالشوئی بیلے' کا مصنف اُسے 'آدم' لکھتے ہیں ۔ ظ ۔ ا

البرٹ کے سینے کی چنگاری ابھی سرد نہیں ہوئی تھی۔ وہ رات کے پچھلے پہر گھومتا پھرتا ژیزل کی قبر پر پہنچا۔ نامراد لڑکیوں نے اس نوجوان کو بھی گھیر لیا، قریب تھا کہ وہ بھی اسی انجام کو پہنچے کہ اتنے میں ژیزل کا سایہ پڑتا ہے۔ وہ ناچ ناچ میں اپنے البرٹ کی جان بچانے کی فکر کرتی ہے۔ اس کی پاک محبّت اور اس کا ایثار البرٹ کی آخری لمحے تک حفاظت کرتا ہے۔

صبح کے سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ وہ شفاف سائے پگھل جاتے ہیں۔ ژیزل بھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ موت کے بعد بھی البرٹ کو موت کے پنجے سے بچا کر ہمیشہ اس کے سینے کو آباد رکھے گی۔ موت اس محبّت کے حصار کو توڑ نہیں سکتی۔

افسانے کے تانے بانے کو باقی رکھتے ہوئے ہمارے دور کے ایک بے مثل فن کار آصف نیمت نے اس بیلے کو یہ روپ دے دیا ہے اور ڈھائی گھنٹے کا یہ متحرک، مترنم منظر ذی ہوش تماشائیوں کے سینے میں ایسے نرم انسانی جذبے جگا دیتا ہے جنھیں صدیوں کے فاصلے اور نظریوں کے 'فیصلے' بھی مٹا نہیں سکتے۔ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادبی تحریکوں کا بیلے کی تخلیق میں زیادہ سے زیادہ کتنا حصّہ ہو سکتا ہے۔

انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے بیلے پر ایسا وقت بھی آیا، جب اسے ادب سے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا۔ بلکہ صرف نسوانی حسن کو جنّتِ نگاہ بنانے اور سنگیت کے مدھم اور پنچم سروں کو فردوسِ گوش رکھنے کے سوا بیلے کا کوئی سنجیدہ مقصد نہیں تھا، اور اس کے بیلے یونانی دیومالا کے افسانے اور جن پری کے قصّے کافی ہونے لگے تھے، حالاں کہ ۶۰، ۷۰ برس پہلے فرانسیسی اہلِ قلم فاضلوں (انسائیکلوپیڈسٹوں) نے اس پر کڑی تنقید کی تھی۔ روسو اور ہریم نے خیال اور مقصد کی اہمیت جتائی تھی، گلیوک اور نوویر نے اپنی فنی قابلیت سے بیلے کی ظاہری آرائش کو فکر و نظر کے موضوع بخشے تھے اور اس طرح اٹھارویں صدی کو جو بیلے میسّر آیا تھا اس کو اہلِ ادب کی نگہِ کرم بھی ملی تھی اور ادب کے شہپاروں کی چاشنی بھی۔ یہاں چاشنی کا لفظ اس خصوصیت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ ادبی تحریروں کو نظموں، افسانوں، ڈراموں کو بنیاد بنا کر جو بیلے ہماری اس صدی میں کامیاب ہوئے ہیں ان میں اصل مصنّف کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے۔ وہ کتاب جو بیلے کے لیے تیار کی جاتی ہے وہ "لبریٹو" لکھنے والے کی کاوش ہوتی ہے، اس میں نغمہ نگار، کوریوگرافر اور مصوّر کے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے اور پھر خود ڈانسر کی شخصیت جو کردار کو گہرائی اور وسعت عطا کرتی ہے۔ شکسپیئر کے مشہور ڈرامے "میکبتھ" کو بیلے کے روپ میں ڈھالنے سے چائیکوفسکی جیسے بے پناہ نغمہ نگار نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس کی شاعری کو بیلے میں سمونا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

کسی بھی شاعری یا شاعرانہ ڈرامے کو بیلے میں سمونا دراصل اس شاعر کا کام ہے جو خود بیلے کی منڈلی میں مصوّر، کوریوگرافر یا نغمہ نگار کی حیثیت سے شریک ہو، یا شریک رہ چکا ہو۔ پچھلے پچاس ساٹھ سال کے دوران لوپے دے ویگا (اسپینی شاعر، ڈراما نگار) شکسپیئر، بالزاک، وکٹر ہیوگو، گستاف فلابیر، پوشکن، لیرمنتوف، پرشوف، گوگول، چیخوف، ژان کوکیٹو (فرانسیسی شاعر، مصوّر اور ڈراما نگار، جن کا حال میں ہی انتقال ہوا ہے) ہمنگوے، برنارڈ شا جیسے مصنّفین کی تحریریں اور بہت سے ناول اور قصّے مثلاً 'دون کی خوت' 'کارمن'، 'اسپارٹکس'، 'ڈوان جوان' 'الف لیلہ' 'شیریں فرہاد' 'لیلیٰ مجنوں' اب تک بیلے کے فریم میں سما چکے ہیں، لیکن اول تصنیفوں سے ان کا تعلق بس اس قدر رہ گیا ہے جتنا واقعاتِ کربلا کا لکھنؤ کے مرثیوں سے[1] صرف مکتوب کی نمائندگی نہیں ہوتی بیلے میں، بلکہ وہ خیال اور جذبہ، وہ کردار اور تصوّر جو ادبی تحریر کے پیچھے ہوتا ہے۔ بیلے کے مصنّفوں کو دور سے راستہ دکھا دیتا ہے۔ اور پھر اس کی انگلی کا اشارہ بھی بدلتا

---

[1] غالب نے کیا کمال کی بات کہی ہے۔

نشاطِ جم طلب از آسماں نہ شوکتِ جم
قدح مباد ز یاقوت بادہ گر عنبی ست

(تقدیر سے طلب کرتے ہو تو وہ نشاط طلب کرو جو جمشید کو میسّر آیا، جام میں شراب انگور کی ہونی چاہیئے، پیالہ یاقوت کا نہ ہو تو کوئی ہرج نہیں) ظ۔ ا

رہتا ہے۔

شاعرِ اعظم پوشکن (۱۷۹۹-۱۸۳۷ء) کی نظموں کو اب سے ایک سو چالیس سال پہلے ماسکو کی بیلے کمپنی نے روسی ڈانسر اور کوریوگرافر آدم گلز کوفسکی کی رہنمائی میں خیالات کے ایک سرچشمے کی حیثیت سے چنا تھا۔ اس کی طویل ڈرامائی نظم "روسلان اور لودمیلا" پھر چند سال بعد طویل مختصر نظم "قفقاز کا قیدی" بیلے کے لیے کچے مال کے طور پر کام آئیں، بعد میں بھی یہ سلسلہ گاہے ماہے جاری رہا، البتہ ادھر بیس بائیس سال سے نغمہ نگار آصف ئیف نے کلاسیکی ادب کو بیلے سے جوڑنے کی پرانی رسم پھر تازہ کی ہے۔ "بخشی سرائے کا فوارہ" اور "تانبے کا شہسوار" نظمیں بہت کامیاب بیلے کا روپ اختیار کر چکی ہیں۔ نیا روپ اختیار کرنے میں ان نظموں کا پورا ڈھانچہ بدل گیا ہے۔ اگر یہ دھیان میں رکھا جائے کہ پرانا اور نیا روس اپنے شاعر و افسانہ نگار پوشکن سے کس قدر عشق کرتا ہے تو ان دونوں کے بیلے دیکھنے کے بعد ہم پہ بیلے اور ادب کا رشتہ قطعی کھل جائے گا۔

پوشکن کی نظم "بخشی سرائے کا فوارہ" ایک دل نشین تصویر اور شیخ سعدی کے ایک جملے کے ساتھ (میں اور میری طرح اور بہت سے لوگ اس فوارے کو دیکھنے گئے، لیکن بعض تو مٹ چکے ہیں، اور بعض کافی فاصلے پر بھیلے ہوئے ہیں) یوں شروع ہوتی ہے!

خان گرییٔ منھ کو حقّہ لگائے، اداس اپنے محل (کرائمیا) میں بیٹھا ہے۔ خادمانِ محل دست بستہ حاضر ہیں۔ محل میں ہر طرف سنّاٹا ہے۔ خان کے چہرے پر فکر اور بددلی کے آثار ہیں۔ خان نے ہاتھ جھٹک دیا اور سب منھ لٹکائے چل دیے۔

تنہائی میں وہ ٹھنڈی سانسیں بھر رہا ہے اور روح مضطرب ہے۔ شاعر کہتا ہے، ایسی کیا بات ہو گئی، کون سی فکر ہے! کہیں پھر روس پر چڑھائی کرے گا یا پولینڈ پر غلبہ حاصل کرنے کی دھن ہے؟ کسی سے انتقام لینے کی آگ سلگ رہی ہے یا فوج میں بغاوت کی سازش پکڑی گئی؟ پہاڑی لوگوں نے سر اٹھایا یا جنوئی (اٹلی) میں آفت برپا ہوئی۔ نہیں اب وہ دن نہیں رہے۔ جنگی نخروں کو وہ ترس گیا۔ ہولناک بازو تھک چکے ہیں۔ اب جنگ تصوّر سے بھی دور ہے (پوشکن نے جس زمانے کی یہ تصویر کھینچی ہے وہ ہے ۱۷ ویں صدی، جب کرائمیا کے خانوں اور اٹلی کے سرحدی باشندوں میں ٹکراؤ ہوتے رہتے تھے۔ ظ۔ ا)

کہیں خدانخواستہ حرم میں سے تو کسی نے دغا نہیں کی، وہ جو نازو نعم کی پلی ہوئی بے زبان کنیزیں ہیں ان میں سے کوئی کسی کافرِ کرستان کو تو دل نہیں دے بیٹھی؟ آخر ہوا کیا؟

اب حرم کی معمول زندگی کا نقشہ تقریباً سو مصرعوں میں دینے کے بعد شاعر بتاتا ہے کہ اس کے محل کی حسینائیں اپنے مالک کی بے توجہی کی شکار کس طرح آپس میں چہلیں کرتی پھرتی ہیں۔ شربت کے دور چل رہے ہیں اور اتنے میں کوئی عورت گیت چھیڑتی ہے۔ تاتاری گیت - اس گیت کی تان ٹوٹتی ہے ملکہ خانم زریما کی مدح پر۔ مگر ملکہ تو سب سے بے خبر الگ تھلگ پڑی سوکھتی جا رہی ہے کیوں کہ اب اس سے خان کی محبت سرد پڑ گئی۔ یہ حسینہ جس کی ایسی آنکھیں اور ایسی زلفیں ہیں کیونکر دل سے اتر گئی! اچھا، جب سے پولینڈ کی شہزادی ماریا حرم میں داخل کی گئی۔ وہ تنہا، چپ چاپ اور اداس رہنے لگا ہے۔

یہاں سے پولینڈ کے شاہی محل میں ماریا کی زندگی اور بہار کے دن دکھائے گئے ہیں۔ پھر ذکر ہے کہ کرائمیا کی تاتاری فوج نے پولینڈ کو تاخت و تاراج کر دیا۔ باپ قبر میں گیا۔ بیٹی قید میں پڑی۔

اس کے بعد خان کے حرم کی کیفیت آتی ہے جہاں خان گرییٔ آسائشوں سے بے زار ہے اور بے خواب راتیں گزارتا ہے۔ اسے ماریا سے محبت ہو گئی اور اب شقاوت کی کوئی حرکت اس سے سرزد نہیں ہوتی۔ ماریا جتنے آنسو بہاتی ہے، خان کے سینے پر وہ انگارے بن جاتے ہیں اور وہ اپنی ایک سے ایک دلربا حرم سے بے نیاز ہو کر تنہائی میں گھلتا رہتا ہے۔

ایک بار رات گئے سوتیا ڈاہ سے تنگ آ کر زریم (جارجیا کی گرم مزاج حسینہ) اس الگ تھلگ حرم سرا میں داخل ہوتی ہے جہاں ماریا تن تنہا سو رہی تھی۔ ماریا کی معصومیت پر اس کا

دل نرم ہو جاتا ہے اور وہ اسے جگا کر التجا کرتی ہے کہ میں بھی ایک باہر کی عورت ہوں۔ میں نے جوانی کے بہترین دن اس سورما کے ساتھ یوں گزارے ہیں کہ وہ جنگ تک سے، جو اس کی گھٹی میں پڑی تھی بیزار ہو چکا ہے۔ جس طرح میں نے اس سے پیار کیا، تو نہیں کر سکتی۔ تو میرے راستے سے ہٹ جا، میں جانتی ہوں کہ تو بے قصور ہے، مگر تیرے حسن و جوانی نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ میں تیرے آگے سر جھکاتی ہوں۔ تجھ سے گڑگڑا کر اپنے گریئی کو مانگتی ہوں۔ میں اور تو ہم مذہب ہیں۔ قسم کھا کہ میری راہ میں نہ آئے گی۔ اور اگر یوں نہ مانی تو پھر سمجھ لے کہ میں قفقاز کی بیٹی ہوں اور یہ رہا خنجر — !

ماریا خاموش رہی، کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے اور وہ کیا کرے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ماریا غائب ہو گئی۔ کچھ پتہ نہ چلا کیا ہوئی۔ کوئی اس راز کا بتلانے والا نہ تھا۔

خان گریئی اپنے محل کے ماحول سے ایسا بیزار ہوا کہ پھر فوج تیار کر کے آس پاس یلغار کرنے لگا۔ بے جرم و خطا سخت سزائیں دینے لگا۔

جب آس پاس تباہی بچا کر راجدھانی میں واپس آیا تب بھی ماریا کی یاد غم کا فوارہ بن کر پھوٹ رہی تھی۔ محل کے ایک کنارے اس نے سنگ مرمر کا فوارہ بنوایا۔ اس پر ہلال کا نشان نصب کرایا۔ اس میں پانی چڑھتا ہے اور آٹھوں پہر آنسوؤں کی طرح ٹپکتا رہتا ہے۔ لڑکیوں کی زبان سے اب "یہ آنسوؤں کا فوارہ" مشہور ہو گیا ہے۔

یہاں تک کہانی بیان کرنے کے بعد شاعر بتاتا ہے کہ وہ اس مقام پر پہنچا۔ چاروں طرف کے گھنے باغات اب بھی ماضی کی یاد دلاتے ہیں اور قبریں رہ گئی ہیں جن پر لوحِ مزار نصب ہے۔ نہ خان ہے نہ اس کی یلغار، نہ وہ قہقہے ہیں، نہ چہچہے۔

شاعر کو سایہ سا گزرتا محسوس ہوا۔ یہ کس کا سایہ، اس معصوم ماریا کا، یا رقابت کی آگ میں جلتی ہوئی زریما کا؟ دونوں پردیس سے آئی تھیں۔ شاعر اب ان سے مخاطب ہے۔ اور پھر اس تمام منظر سے، اور آخر ایسی کیفیت میں کھو جاتا ہے جہاں دھرتی کا غم، انسان کے آنسو، انگور کی بیلوں کی مہک اور بے گناہوں کا خون سب تصویریں خلط ملط ہو جاتی ہیں۔

والکوف نے اس نظم کو بیلے کے لیے پھر سے لکھا اور آصف ئیف نے اس میں نغمے اور آرائش کا ایسا تسلسل اور آہنگ قائم کیا جس سے ایک بھرپور بیلے سامنے آیا۔ گالینا اولانووا نے، جنھیں پچھلے بیس سال سے دنیا کی بہترین بیلے رینا سمجھا جاتا ہے، اپنا شاندار کیریر اسی بیلے سے شروع کیا تھا۔ ان کی تہہ دار شخصیت ہمیں نظم سے زیادہ بیلے میں ظالم اور معصوم، بوڑھے اور جوان، فاتح اور مفتوح کی اندرونی کائنات اور گہری نفسیات کو سمجھنے کی ترغیب دی۔

بیلے میں اس کی ترتیب یوں ہے کہ پولینڈ کے ایک جاگیردار کے یہاں دعوت ہو رہی ہے۔ امراء جمع ہیں۔ جاگیردار کی بیٹی ماریا کا منگیتر واکلا بھی موجود ہے اور جب درباری رقص (بال) شروع ہوتا ہے ماریا اور واکلا جوشِ الفت میں ڈوب کر رقص کرتے ہیں۔ رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ تاتاریوں نے حملہ کر دیا۔ جاگیردار اور عزیز رشتہ دار سب مارے گئے۔ واکلا خاں گریئی کی تلوار سے اپنی محبوبہ کے بچاؤ میں کام آیا۔

دوسرے منظر میں خان کا محل، اس کی چہیتی بیوی سیاہ زلف آہو چشم زریما اپنے شوہر کے انتظار میں ہے۔ گریئی فتح مند واپس آیا مگر اب وہ بالکل بدلا ہوا ہے۔ قیدیوں میں ایک لڑکی لائی گئی ہے ماریا۔ اب خان کی چشم التفات ادھر ہے۔ جو کل تک لہو پیتا پھرتا تھا، اب محبت کی آگ میں اسی کا لہو سوکھتا جا رہا ہے (ماریا اس سے نفرت کرتی ہے) محبت نے اسے کریم اور خطا بخش بنا دیا اور جب زریما کی سوتیا ڈاہ نے ماریا کی زندگی کا چراغ اپنے خنجر سے بجھا دیا تب بھی وہ زریما کے قتل کا حکم نہیں دیتا صرف آنسوؤں کا فوارہ بنواتا ہے۔ اب وہ فاتح نہیں خود مفتوح ہے اور محبت نے تشدد کے شعلے سے اس کا دامن آزاد کر دیا ہے۔ بیلے ختم ہوتا ہے تو ہم بہت سے نفسیاتی پیچ و خم سے گزر کر یہ احساس لیے اٹھتے ہیں کہ دل کی ایک نیام میں یہ دونوں تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ محبت اور بے رحمی۔

اس طرح بیلے نے اگرچہ پوشکن کی نظم کے ڈھانچے میں

بڑی تبدیلی کر دی۔ مگر نظم نے کرداروں کے علاوہ خود شاعر کے بنیادی تصور اور لجد کے تحیر کا بھی راز بے نقاب کر دیا۔ دراصل یہی بیلے اور اچھے ادب دونوں کا منشا بھی ہے۔

بیلے، کل اور آج

یہاں تک پہنچ کر بیلے کی روپ ریکھا پڑھنے والوں کو مل جاتی ہے۔ لیکن چند اہم سوال پھر بھی باقی رہتے ہیں۔ مثلاً بیلے کی تاریخ کیا ہے، اس کے موضوعات ابتداء سے وہی ہیں یا ان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ آج بیلے کا فن کس پوزیشن میں ہے اور ہمارے ملک میں اس کے کیا امکانات ہیں . . . وغیرہ

ان سب سوالوں کا جواب ایک مختصر مضمون میں اور ایک ہی عنوان کے تحت دیا جا سکتا ہے اس طرح اختلافی بحثوں کی گنجائش بھی کم رہے گی۔

جو کتابیں اس موضوع پر میری نگاہ سے گزری ہیں، ان میں بیلے کی ابتداء کے متعلق فرانسیسی، انگریز اور آسٹرین مصنفین کی تقریباً وہی رائے ہے جو آرنلڈ ہیسکل (انگریز نقاد) کی کتاب 'Ballet' کے باب 'تاریخی پس منظر' میں ان لفظوں کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

یونانی تہذیب کے عروج کے دور میں اس قسم کی رقاصی موجود تھی۔ رومن شہنشاہ بھی اس سے واقف تھے اور اسے کام میں لاتے تھے۔ رقاصی کے اس شکل نے اٹلی سے فرانس کا سفر کیا اور فرانس کے منطقی دماغ نے (یوں کہنا چاہیئے کہ) اس کے اصول اور ضابطے مقرر کیے اور وہ بیلے آرٹ بن گیا۔

آج ہم جس فن کو بیلے کہتے ہیں اس کا وجود فرانس کی نیشنل ڈانس اکادمی کی بنیاد پڑنے سے وابستہ ہے۔ یہ اکادمی لوئی چہاردہم نے ۱۶۶۱ء میں قائم کی تھی؛ تب سے آج تک بیلے ڈانسروں اور استادوں کا ایک بے خلل سلسلہ چلا آرہا ہے۔ جب فرانس میں ایک اطالوی سازندے نے (۱۵۸۱ء میں) پہلا بیلے پیش کیا (اس وقت تک بیلے میں رقص و موسیقی کے ساتھ گانا بھی شامل تھا۔ یہ ہمیں چارلس ڈکنس کے ناول بلیک ہاؤس اور بعض دوسری شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ نظ۔ا) موسیقی اور رقص کے درمیان تقسیم اس کے بعد عمل میں آئی۔

فرانس کا خوش ذوق بادشاہ لوئی چہاردہم جو اتفاق سے ہمارے شاہجہان کا ہم عصر بھی ہے، اس آرٹ سے بہت محظوظ ہوا اور اس نے کئی رول ایجاد کیے جو بیلے کی روایت میں کھپ گیے۔ وہ خود بھی واجد علی شاہ کی طرح ڈانس کرتا تھا، اور ایک ایک بیلے میں اس نے کئی کئی رول کیے ہیں۔ الناس علیٰ دین ملوکہم۔ امراء میں بھی بیلے کا رواج بڑھ گیا۔ ایک فیلڈ مارشل بیلے کے ایسے شیدائی نکلے کہ انھوں نے اپنا جنگی مراسلہ ہی بیلے کی اصطلاحوں میں روانہ کر دیا۔[۴] درباریوں نے اس 'پیشہ ورانہ فن' میں شامل ہو جانے کا وہی اثر ہوا جو کسی عام زبان پر ہوتا جب وہ درباری اور سرکاری بن جائے۔

جس بیلے سے ہم واقف ہیں وہ اس وقت پیدا ہوا جب پیشہ ور کی اُچھل کود اور درباریوں کا امیرانہ رکھ رکھاؤ یکجان ہو گیے . . . ."

لباس کی تراش خراش پر انقلاب فرانس سے پہلے کی امیرانہ وضع طاری ہو گئی۔ بھاری زرق برق لبادے۔ ٹخنوں سے نیچے تک کے غرارے اور کمر میں کسی ہوئی تنگ چولیاں، بیلے کے قدموں کی پانچ ترتیبیں، جن کی وہی بنیادی حیثیت ہے جو سا رے گا ما کے سات سروں کی سنگیت ودیا میں، اٹھارویں صدی کے آغاز میں ذرا ترمیم کے ساتھ استعمال ہوتی تھیں اور ان کو اطالوی اور فرانسیسی دونوں رقاصوں اور استادوں نے اپنے اپنے قومی مزاج کے مطابق ڈھالا ہے۔ اطالویوں نے اپنے جنوب والے گرم مزاج کی تڑپ بخشی تو فرانسیسیوں نے حسب معمول نفاست اور نزاکت۔

وہ پہلا شخص، جس نے آرٹ کی اس نئی شکل کو فن کی ایک علاحدہ

۴۔ 'بالشوئی تھیٹر' میں پوشکن کی ایک عظیم الشان نظم 'تانبے کا شہسوار' کا جو بیلے پیش کیا جاتا ہے اس میں شہنشاہ پیٹر اعظم کو بال روم ڈانس کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ مصنف کے یہاں، یا کسی اور فنی کتاب میں اس کا ذکر نہیں کہ پیٹر اعظم کے درباری ناچوں میں خود بادشاہ کس قسم کا ڈانس کرتے تھے۔ اس لیے گمان گزرتا ہے کہ یہ منظر لوئی چہاردہم کی اُن تصاویر کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہو جو پیرس، ڈرلیڈن یا دوسری آرٹ گیلریوں میں محفوظ ہیں۔

مکمّل اور بھرپور شکل دی، فرانسیسی نودیر ہے جو اٹھارویں صدی کے بعد کے پچاس برس یورپ کے ملک ملک گھومتا پھرا، جا بجا اس نے بیلے کے متعلق اپنے خیالات اور ان کے عملی نمونے پیش کیے۔ اس نے عموماً اس بات پر زور دیا کہ بیلے کو محض وقتی تفریح نہیں ہونا چاہیے۔

"سلیقے کے ساتھ ترتیب دئے ہوئے بیلے کو ڈرامے، کردار اور انسانوں کے رسم و رواج کی تصویر ہونا چاہیئے۔ اس کی ایکٹنگ یوں کی جائے کہ اس کا اثر وہی ہو جو کسی ادب پارے کی ادائگی کا ہوتا ہے تاکہ وہ آنکھوں کے ذریعے روح سے بات کر سکے۔۔۔۔"

نودیر (۱۸۱۰ء میں انتقال ہوا) کے بیلے میں وقت کے بہترین فن کار جمع ہوتے رہے جن میں اطالوی بھی تھے، فرانسیسی بھی، جرمن بولنے والے بھی اور روسی بھی، جس میں فرنچ بیلے رینا "ل گیمار" کا نام سب سے اوّل آتا ہے۔ آج کے بیلے کے لیے یہ دور کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔

انقلاب فرانس کے چند سالوں کی افراتفری میں یہ فن پھر اطالیہ میں اُبھرا۔ ویگانو اور کارلو بیس، دونوں بیلے کے اطالوی ستون ہیں، جن کے دم سے ملان شہر (اطالیہ) میں بیلے کا مرکز قائم ہوگیا۔ بلاسس مصنّف بھی تھا، سیاست کا کھلاڑی بھی اور آرٹ کے ہر ایک شعبے سے باخبر۔ اسی کی تحریک کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ ملان میں، بیلے کی جنم بھومی میں "نرت کلا اکادمی" قائم ہوئی۔

نودیر، کارلو بلاسس اور ویگانو کے شاگرد ہی دنیا بھر میں پہنچے ہیں۔ روسی بیلے اور انگریزی بیلے کے بہترین فن کاروں نے انھیں سے تربیت پائی ہے اور پھر الگ الگ قوموں نے اسے اپنے اپنے طریق پر ڈیولپ کیا ہے۔۔۔۔

(یہ چند پیراگراف ہسکل کی کتاب پر مبنی ہیں)

لیکن روسی نقّاد یہاں تک کی تاریخ سے پوری طرح اتّفاق نہیں کرتے اور بیلے کے معاملے میں ہم روسی فن شناسوں کی رائے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بڑی انسائیکلو پیڈیا (جلد چہارم ص ۱۲۴-۱۲۱) میں ایک مستند رائے یہ ملتی ہے:

۔۔۔۔ بیلے کے سرچشمے، عوامی تھیٹر کے قصیہ عناصر میں اور عام لوگوں کی موسیقی میں ملیں گے۔ قدیم سلاف قوموں کے کھیل کود اور ناچ گانوں میں ڈانس کو تھیٹری شکل دی جاتی تھی۔۔۔۔

۱۷۴۴ء میں "پھولوں کا بیلے" دربار (پیٹرسبورگ) میں پیش کیا گیا تھا۔۔۔۔ بیلے کا سنگیت جو لوک ناچوں کی بنیاد پر تیار کیا گیا، جو فوک لور کے انداز سے ذرا ہٹا ہوا ہے، وہ بھی ابتدائی دَور کے روسی اوپیراؤں سے قطعی طور پر وابستہ ہے۔۔۔۔

۱۷۳۶ء میں پیٹرسبورگ میں اور ۱۸۰۶ء میں ماسکو میں مستقل بیلے منڈلیاں قائم ہو چکی تھیں۔۔۔۔ روسی بیلے ڈانس نے روس کے لوک ناچوں کے اجزا اپنے اندر سمو لیے، جن میں قومی کردار کے شوخ رنگ کا اظہار ہوتا تھا۔۔۔۔

روس میں بیلے کی ابتدا، خواہ ان استادانِ فن کے دم سے ہوئی ہو جنھوں نے پیرس اور ملان کے ترقّی یافتہ مرکزوں سے سیکھا یا سلاف قوموں کے لوک ناچوں سے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے روس کا یوروپی علاقہ جو برلیسٹ کے قلعے سے لے کر یورال کی پہاڑیوں تک ہزاروں کلو میٹر کی مسافت میں پھیلا ہوا ہے، بیلے کے فن کے لیے بہت زرخیز ثابت ہوا۔ دُور دُور امراء کی جاگیریں بکھری ہوئی تھیں! چھ سات مہینے زمین برف پوش رہتی ہے، زرخرید کسانوں (سرفٹ) کی پوری پلٹنیں سے کار پڑی رہتی تھیں یہاں تفریح طبع کا سامان بھی تھا اور اس کی ضرورت بھی، چناں چہ ان مضافاتی تھیٹروں میں بہترین موسیقار، نغمہ نگار، ڈانسر اور ایکٹر پرورش پاتے اور جس کی تقدیر یاوری کرتی وہ وہاں سے نکل کر پیٹرسبورگ ماسکو اور کیئف کے مرکزی تھیٹروں تک پہنچ جاتا تھا جہاں پہلے سے غیر ملکی فن کار اور استادوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ اور پھر یہیں سے ایسی کامیاب شخصیتیں ابھریں جنھوں نے بیلے کے روسی مرکز کو تمام مہذب دنیا سے منوا لیا۔ مثلاً بیلے ماسٹر دیلی کوف (وفات ۱۸۱۵ء) اور دیدلو (وفات ۱۸۲۷ء)

ابتداء میں اس کے موضوعات یونانی دیومالا کے قصّے، جن پری کی کہانیاں اور ایسے افسانے ہوا کرتے تھے جن میں الگ الگ رقصوں کی زیادہ سے زیادہ گنجائش ہو اور رقص بھی اقلیدسی شکلوں

کی ادل بدل سے ترتیب دے جاتے تھے، انھیں میں کہیں لوک ناچ اور قبائلی ناچ بھی جوڑ دئے جاتے تھے۔ پیرس کا اوپیرا تھیٹر قائم ہونے کے بعد (جو آج بھی اوپیرا، پیرس کے نام سے سیاحوں کی زیارت گاہ ہے) اور اس کے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد ملان میں اکادمی بن جانے کے بعد ان مختلف اجزا کو ایک کل "میں بدل دیا گیا اور بیلے نے عام ناچوں سے ہٹ کر کچھ ایسے قدم، ایسی گردشیں اور ناچوں کو ربط دینے والے ایسے ٹکڑے بڑھائے جنھوں نے بیلے میں اوّل سے آخر تک ایک تاثر پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ سترھویں صدی کے آخر میں فرانسیسی ڈائرکٹر لولی نے اس پر زور دیا تھا کہ موسیقی کی معنویت بڑھائی جائے اور اس کا ڈرامائی عمل سے تعلق اور گہرا کیا جائے۔ شکسپیئر اور مولیر کے شاعرانہ ڈراموں نے بھی بیلے میں راہ پائی تو یہ امکان اور بڑھا۔ لولی کے شاگرد نژاد فت، راموں نے اوپیرا بیلے "Gallant India" پیش کر کے کچھ اضافوں سے دنیا کو روشناس کیا۔ فرانسیسی بیلے ماسٹر دیرے وال کا نام اٹھارویں صدی کے آخری دَور میں بہت نمایاں ہے جس کے بعض بیلے آج بھی ذرا بدلی ہوئی شکلوں میں فرانس، انگلینڈ اور روس میں دکھائے جاتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے خاتمے تک جن ڈانسروں، بیلے ماسٹروں، کوریوگرافروں یا بیلے کی پوری تنظیم کرنے والوں کے نام آتے ہیں ان میں فرانسیسی اور اطالوی حاوی ہیں۔ مثلاً کمسارگو، لاتی، سلّے، ہُنیل، گیماد، گاردیل، ادوپہ سیہ، دیسترس (باپ اور بیٹا) اور نوویر۔ اس عہد کے سب سے بڑے نغمہ نگاروں کے موسیقی کے ٹکڑے اگرچہ بیلے میں استعمال کیے جاتے رہے، مثلاً گلوک، موزارٹ، بتھووِن، تاہم کسی بڑے نغمہ نگار نے بیلے کو اپنے فن کا میڈیم نہیں بنایا تھا۔ یہ کام بعد میں زیادہ تر روسیوں نے انجام دیا۔

انیسویں صدی شروع ہوتے ہوتے بیلے کا رومانوی دَور چھا جاتا ہے یعنی حقیقت سے فرار، خوابوں، خیالوں اور آرزوؤں سے ایک طلسماتی دنیا کی نمود کا دور۔ اور اسی دَور میں بیلے نے الگ الگ ملکوں میں اپنے قومی مرکز قائم کر لیے۔ فرانس، اطالیہ، آسٹریلیا، ڈنمارک، انگلینڈ اور روس۔ جن میں آخری نام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

ململ کے ہلکے پھلکے اور ذرا اونچے پھولے ہوئے فراک، مردانہ فیشن میں رانوں پر پھنسے ہوئے چست پاجامے اور بے ایڑی کے جوتے، مردوں کے بجائے عورتوں کے ڈانس کا اول مقام، اور پیروں کے 'پوائنٹ' پر تھرکنا، اونچی چھلانگ اور کود سے 'بیلے' کی اسپرٹ سے ہٹ کر انفرادی کمال دکھانا، رقص کی کاری گرانہ نزاکت کو بیلے میں رکھ کر بھی پورے بیلے سے الگ دل کش آئی ٹم بنا دینا، اسی دَور کی دین ہیں۔ اسی دَور میں والز، گیلپ، پولکا، مازورکا، پولونیز اور مادرچ کے رقصیہ طرز اپنی خاص موسیقی کے ساتھ بیلے میں زیادہ مقبول ہوئے۔ اس دور نے بڑے مقبول ڈانسر، ایکٹر اور کوریوگرافر پیدا کیے جن کی تصویریں آج بھی کنسرٹ ہالوں اور نشست گاہوں کی زینت ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اطالیہ، فرانس اور آسٹریا کے کئی نمایاں استادانِ فن، ایکٹر، تعلیم دینے والے اور ڈائرکٹر روس میں بلا لیے گئے۔ زارشاہی روس کے با اقتدار طبقے چوں کہ مغرب کا رعب مانتے تھے، انھوں نے روس کی قومی ہنرمندی پر ان باہر والے گنتی مشاہیر کو ترجیح دی اور وہ لوگ بھی ایک عرصہ دراز کے لیے روس میں ہی رہ پڑے۔ انیسویں صدی کے وسط سے ژ، پیرو، سن لیون اور پتی پا نے یہیں اسی ملک میں کام کیا۔ پتی پا ۱۸۴۸ء سے ۱۹۰۳ء تک پیٹرسبورگ میں رہا اور اس نے ۶۰ سے زیادہ بیلے تیار کرائے۔"

(بالشایا سوویتسکایا انسائیکلوپیڈیا جلد چہارم ص ۱۲۴)

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ انیسویں صدی کے وسط سے آج تک بیلے کی تاریخ بڑی حد تک روسی بیلے کی تاریخ ہے اور اس کے باوجود کہ روس میں آج بھی فرانسیسی استاد پتی پا کی ٹریڈیشن چل رہی ہے اور ایک زبردست انقلاب کا گہوارہ اپنے فن کے معاملے میں پرانی لکیر کو پیٹے جا رہا ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کلاسیکی اور رومانی دَور کی بہترین خصوصیات کو، کلاسیکی موسیقی، رقص اور ادب کے رشتے کو روسی بیلے نے ہی ناپید ہونے سے بچایا ہے۔

روسی ملکہ اینے نے ڈانس اکادمی ۱۷۴۰ء میں قائم کی تھی لیکن اس کی اہمیت بڑھی۔ ملکہ ایلکا ترینا کے زمانے (اٹھارویں صدی کے آخری نصف) میں، جب اس عیش پسند ملکہ نے اطالیہ اور فرانس کے چنے ہوئے فن کاروں، وجیہ امراء اور یورپ کے فیشن ایبل لوگوں کو

اپنے دربارِ خاص میں جگہ دی۔

۱۷۷۶ء سے بالشوئی تھیٹر (ماسکو) میں بیلے باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے۔ یتیم خانے کا وہ خوب صورت احاطہ ("ڈیو سے چی موناسیتر") جہاں کبھی بیلے کی تعلیم کا مرکز تھا، اب بڑوں کا قبرستان ہے اور بیلے کی تعلیم کے لیے بالشوئی کے نزدیک ہی ایک خاص اسکول ہے جہاں ۳۵۰ لڑکے لڑکیاں ان ۲۰۰ آرٹسٹوں کی جگہ لینے کی تیاری کر رہے ہیں جو فی الحال بالشوئی تھیٹر کی بیلے کمپنی سے وابستہ ہیں۔

بیلے کے فن میں اوّل روس نے، پھر پورے سوویت روس نے جو کارنامے انجام دئے ہیں، انھیں کسی طرح اس مضمون میں سمویا نہیں جا سکتا۔ اشارے کے طور پر چند نکتے ضروری ہیں:

• روس بڑی حد تک ایک زراعتی ملک تھا (لینن کے اس پمفلٹ کے باوجود، جس میں انقلاب سے پہلے یہ جتایا گیا تھا کہ روس میں بورژوازی قوت اور مزدوروں کی تعداد بڑھ گئی ہے) اور خانہ جنگی (۱۹۱۸-۲۲ء) کے بعد بھی زراعتی ماحول کا جو اثر مزاجوں اور ذہنوں میں محفوظ تھا، اس نے روسی بیلے کو قومی مزاج اور قومی ماحول سے بے گانہ نہیں ہونے دیا۔ رومانوی دور کا روسی بیلے بھی انفرادیت کے کمال پر نہیں بلکہ 'انسامبل' (پوری منڈلی) کی اجتماعی فن کاری پر زور دیتا ہے۔

• "موڈرن ازم" کی جدید تحریکوں کو غیر ملکی اثرات قرار دیتے ہوئے روسی بیلے نے فن کے ڈرامائی عنصر، موسیقی کے عوامی کردار اور خیال یا مقصد کی اہمیت کو پس پشت نہیں ڈالا۔

• موسیقی، ڈانس اور کوریوگرافی میں روس نے بیلے کے اسٹیج سے صفِ اوّل کے فن کاروں کا روشن ستاروں کا ایک ایسا جھرمٹ دے دیا جس کی تب و تاب آج بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ گلینکا، چائکوفسکی، گلازونوف، ایمسکی کورساکوف، موسرگسکی، بورودین، شاپین، شوستاکووچ، پروکوفیئف، خچوتریان جیسے نغمہ نگار، آنا پاولووا، کرساوینا، تری فولووا، یسرر، گوبووچ، اولسکا، نکولائیووا، وسیلی، گیلتسیر، سوکولوف، گالینا اولانووا، مایا پلیتسکایا جیسے ڈانسر، آدم گلازوسکی، استانی سلافسکی، نیمرووچ دانچنکو، الیکسانڈر گورسکی جیسے ہدایت کار اور منتظم جن کے کام کرنے کے طریقے اب اصولوں اور مثالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

• روس نے فن میں حقیقت پسندی کا جو نعرہ لگایا تھا وہ محض نعرہ نہیں تھا، بلکہ اشتراکی حقیقت پسندی کے عنوان سے اب وہ روسی بیلے کی سب سے اہم حقیقت ہے۔ اب عوامی ناچوں کے بکھرے ہوئے ذخیرے سے (مثلاً ایگور موسیقی کی منڈلی)، عوامی پسند کے ادب پاروں سے موتی چننا (مثلاً "سونے کی مچھلی" یا "کبڑا گھوڑا" پر بیلے)، اہم تاریخی موضوعات کے گرد بیلے بُننا (مثلاً 'انقلاب فرانس پر' 'پیرس کے شعلے'، پولینڈ اور قزاقوں کی جنگ پر 'تاراس بلبا')، اور ادھر گرد کی بدلتی ہوئی زندگی کے موضوعات پر بیلے کی تیاری (مثلاً "سرخ پھول" چین کی انقلابی جدوجہد پر اور "گھن گرج کی ڈگر" افریقہ کی آزادی پر) جہازیوں اور مزدوروں کے ہجوم کو بیلے کی نزاکت میں سمونا، ایسی کامیاب کوششیں ہیں اور ان کے پیچھے ایسے مقصد کام کر رہے ہیں جن کا یہ دعوا کرنا بجا ہوگا کہ ہم نے "عوام کے لیے بیلے ہی نہیں پیدا کیے بلکہ بیلے کے لیے عوام بھی پیدا کیے ہیں۔"

انقلاب ۱۹۱۷ء کے ایک زمانے بعد تک بیلے کا تماشا مفت دکھایا جاتا تھا اور آج جب وہ سرمۂ مفت نظر نہیں ہے، کئی کئی دن پہلے ٹکٹ نہیں ملتا۔ انقلاب کے فوراً بعد شدت اور حدت کا وہ دور تیزی سے گزر گیا جب لڑکیوں کے نام 'ٹریکٹری نا' ہونے لگے تھے اور بیلے کے اسٹیج پر مشینوں کا ناچ دکھایا جانے لگا تھا اور اس پر زور دیا جا رہا تھا کہ "بورژوازی کلچر" کے ملبے سے ہمیں کچھ نہیں لینا ہے۔ اب اسی 'بورژوا کلچر' کے سب سے خرچیلے نمونے دنیا کے سب سے زیادہ بیش قیمت بیلے اسٹیج پر فخر کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں، بیلے، آج کے روس میں صرف اَنٹیلکچوئل ٹولیوں اور خوش حال پیشہ فکر لوگوں کی تفریح نہیں رہا بلکہ عام محنت کشوں کی دسترس میں ہے۔ فولادی کارخانوں کے مزدور ریشم کی لچھی جیسی ان نزاکتوں پر دھیان دیتے ہیں جن کا تعلق بیلے کے فن کی پوری تاریخ سے ہے اور جن کے لیے فن کے ایک ایک پہلو پر نظر ہونا ضروری ہے۔ یہ تماشا ہم نے بارہا

اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محنت، وفن کاری کے اس جدید رشتے پر فخر کرنے کو جی چاہا۔

اطالیہ، فرانس، ڈنمارک اور روس کے پاس بیلے کی ٹریڈیشن (جسے غلطی سے 'روایت' کہتے ہیں) موجود تھی، برطانیہ نے روسی اور فرانسیسی بیلے کمپنیوں کو داد دیتے دیتے پچھلی صدی میں خود بھی ناچنا سیکھ لیا۔ اور اب سیڈلرس ویلس کی کمپنی دنیا میں اپنا مقام رکھتی ہے۔ انگریز چوں کہ کسی ایک چلن یا طرز سے بندھے ہوئے نہیں تھے، ان کے لیے کسی بھی طرز سے سیکھنا اور ردّ و قبول کا عمل کرنا آسان ہوگیا۔ برطانیہ کی بیلے منڈلیاں یورپ اور امریکہ کا گشت کرتی رہتی ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ برطانوی بیلے میں قومی سے زیادہ بین اقوامی اثرات کی جھلکیاں یکجا ہو جائیں۔

امریکہ اس میدان کا نووارد ملک ہے، اس نے بھی فرانس، اطالیہ اور روس کی دیکھا دیکھی قومی بیلے کی تشکیل کی ہے۔ انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ریاست ہائے متحدہ اور جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں روس کی بیلے کمپنیاں گشت کرکے اور سال بھر کے بجٹ کے لیے رقمیں لے کر واپس آ جایا کرتی تھیں۔ پہلا اور دوسرا انقلاب روس امریکہ کے حق میں مفید ثابت ہوا۔ اچھے اچھے ڈانسر آرٹسٹ' تاریخی معلومات کے خزانے اور کوریوگرافر امریکہ پہنچ گئے۔ دیا غلیف کے شاگرد، فوکن اور موردکن جن کے ناموں سے روسی بیلے کی تاریخ بے نیاز نہیں ہوسکتی، امریکہ جا بسے۔ کرنل دی باسل نے یورپ سے وہاں کے کئی چکر کیے اور ۱۹۳۴ء میں بیلے کا امریکی اسکول قائم ہو گیا۔

امریکہ میں بیلے نوخیز ہے تو تازہ دم بھی ہے۔ نیویارک سٹی بیلے میں جہاں کلاسیکی بیلے کے نئے پرانے طرز ملانے کی کوشش جاری ہے، وہیں بالکل نئے اور اچھوتے، میکانکی دور کے بیلے تراشنے کی بھی کئی مثالیں سامنے آ چکی ہیں۔ افسوس کہ ان کے پروگرام کے کتابچے یا کوئی لٹریچر فی الحال میرے پاس نہیں جس کے حوالے دیئے جاسکیں لیکن دی آنا اور ماسکو میں امریکی بیلے کے طرفہ ہونے کی بڑی دھوم تھی۔

انھوں نے کلاسیکی اور رومانی دور کے قیمتی لباسوں اور اسٹیج کی وضعداریوں کو اپنے یہاں سے خارج کر دیا ہے۔ یہ نہیں کہ امریکہ کے مرکزی بیلے نے خیال یا شاعرانہ موضوع کی اہمیت سے انکار کیا ہو، موضوعات کو لباس اور آرائش کو، یہاں تک کہ موسیقی کو بھی (جاز اس میں شامل ہے) اردگرد کی زندگی، اس کے روکھے پن سے لیا جانے لگا ہے، لیکن اس کوشش میں جو ہیئت ہمارے سامنے آئی وہ بیلے کے بجائے ایک بے لفظ ڈرامے کا تاثر پیدا کرتی ہے اور بیلے کے مرکزوں میں اسے کسی اعلا درجے کی فن کاری کا پیش خیمہ نہیں سمجھا جاتا۔

آسٹریا اور ڈنمارک کو بیلے سے پرانا علاقہ ہے مگر ان ملکوں کا شوق یا امتیاز بیلے سے زیادہ اوپیرا میں نظر آتا ہے۔ آسٹریا نے البتہ بیلے کی ایک جدید ترین صنف کو چمکایا ہے اور وہ ہے "آئس ریویو" جسے امریکہ کی کسی بیلے کمپنی نے 'برف پر منورنجن' کے نام سے ہندستان کے بعض بڑے بڑے شہروں میں چند سال پہلے پیش کیا تھا۔ یہ 'آئس ریویو' بیلے دراصل جمے ہوئے برف کے چکنے اور سپاٹ فرش پر اسپورٹس مینوں اور رقص کے کرتب بازوں کا تماشا ہے لیکن اسے بیلے کا نام دیا جاتا ہے اور چند صفات اس میں بیلے کے ہیں بھی۔ ویانا کی آئس ریویو بیلے کمپنی پچھلے دس سال میں دنیا کے کئی ملکوں میں گشت کر چکی ہے اور نوجوانوں کے دل موہ چکی ہے۔ اب امریکہ، کناڈا، سویڈن، روس اور جرمنی میں بھی اس فن کا جواب پیدا ہو گیا ہے۔

بیلے اگرچہ خاص مغرب کی ایجاد ہے لیکن اب، جبکہ مغرب و مشرق کے درمیان فاصلہ سیاح کے لیے چند گھنٹوں میں اور فن کار یا طالب علم کے لیے چند برسوں میں سکڑ گیا ہے، قدرتی طور پر ہم ایشیائی منظر میں بیلے کی تلاش کرتے ہیں۔ ترکی میں (اگر اسے مشرق کی مغربی سرحد کہا جائے تو) حال میں ہی بیلے کے بعض کامیاب مظاہرے ہوئے ہیں اور عجب نہیں کہ تاتاری، قزاق، ارمنی اور ترک ناچوں اور سنگیتوں کی آزمائش سے وہاں رنگ چوکھا آئے۔ چین کے بیلے کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ لیکن چینی منڈلی نے

۱۹۵۷ء کے نوجوانوں کے میلے (ماسکو) میں بیلے کا ایک ایسا مظاہرہ کیا تھا جس نے حسن کے ادھورے نظارے کی طرح اہلِ نظر کی پیاس بھڑکا دی ہے۔

ہندستانی رقاصوں نے بیلے کی طرف پچھلے سترہ، اٹھارہ سال میں خاص توجہ دی ہے۔

اودے شنکر اپنی رقاصہ بیوی کے ساتھ جب یورپ سے ہندستان واپس آئے تو انھوں نے یہاں بیلے سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ غالباً ۱۹۴۵ء میں 'لیبر اور مشینری' 'کلپنا' بیلے دکھایا گیا اور بہت کامیاب رہا۔ "انڈین پیوپلز تھیٹر" نے ۱۹۴۶ء میں جواہر لال نہرو کی تصنیف "Discovery of India" کی بنیاد پر ڈھائی تین گھنٹے کا ایک سنجیدہ بیلے پیش کیا جو پورا تو تھا، بھرپور نہیں تھا اور شاید اسی لیے I.P.T.A نے اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا۔ سچن شنکر شانتی بردھن اور شنترا تینوں نوجوان فنکاروں کو ایک زمانے میں بیلے کی دھن تھی۔ انھوں نے "مچھیرا اور ماہی" "ما عورت" بیلے پیش کیا، پھر یہ گروپ بکھر گیا۔ البتہ Little Ballet Troupe (بمبئی) والے کئی سال سے بیلے کی مشق کر رہے ہیں۔ انھوں نے Decor اور کاسٹیوم میں امتیاز حاصل کیا ہے (یوں بھی ہندستانی ناچوں کے کاسٹیوم کو بیلے کے مقصد کے لیے بہت دلکش سمجھا جاتا ہے) 'میگھ دوت' اور "پنچ تنتر" کے قدیم افسانوی ادب کو بیلے کی شکل دی ہے، ان لوگوں کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہے۔ ہماری دوست گل بردھن اس ٹروپ کی روحِ رواں اس خیال میں محو ہیں کہ ہندستانی بیلے کو مغربی بیلے کا چربہ ہونے کے بجائے ہندستان کے لوک ناچوں اور کلاسیکی رقص اور موسیقی کا نقشِ ثانی ہونا چاہیئے۔ وظیفہ دار بھوں اور کرشنا کٹی کے گروپ نے 'ملکرتت درپن' کے نام سے پانچ سال پہلے چھوٹے چھوٹے کئی بیلے پیش کیے مثلاً 'اروشی کا جنم' 'جیون کی جوت' ان سب سے زیادہ سنجیدہ، با مقصد اور منظم کوشش کتھک کے مشہور استاد برجو مہاراج کر رہے ہیں جنھوں نے کالی داس کے 'کمار سمبھو' کا ایک مکمل اور امید افزا بیلے تیار کیا ہے۔ انڈین نیشنل تھیٹر نے بھی ادھر کئی مختصر بیلے پیش کیے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جواں ہمت لوگ ہیں۔ مغرب میں بالا سرسوتی اور مرنلنی سارا بھائی کو خاص کر اس فن کے مستقبل کے لیے پُر امید نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

ہندستان میں ابھی بیلے کا چلن نہیں ہوا، لیکن ہندستان کے آرٹ کے خمیر میں جو رنگارنگی، افسانویت، گہرا فکری عنصر اور اظہار کے رمزی طریقے صدیوں سے رسے بسے ہوئے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بیلے کا زبردست اسکوپ اس ملک میں ہے، اور اس ملک کی پلیٹ میں ہر اس جگہ جہاں ہندستانی کلچر کے بیج اڑ کر پہنچے ہیں۔

قصہ مختصر بیلے کی تکنیک اور اس کے موضوعات میں پچھلی دو صدیوں کے اندر جس قدر تبدیلیاں آئی ہیں اور وہ بہت دبے پاؤں آئی ہیں، انھوں نے اس فن کو اور بھی وسعت اور گہرائی بخش دی ہے، انسانی بدن موسیقی کے پردوں، تاروں اور روح کی ایک ایک لرزش کی یہ ہم آہنگی ہمیں ماضی کے کلچر کا صرف ایک جلوہ نہیں دکھاتی، بلکہ اس کی خوبصورتیوں اور سچائیوں کا وارث بھی بناتی ہے۔

کلاسیکی دور کی دیومالا مندروں اور غاروں سے نکل کر جیتی جاگتی روحوں کا رقص بنی اور اس رقص کی زبان سے ہم نے وہ افسانے سنے جو بدلتی ہوئی اصطلاحوں کے ساتھ ہماری زندگی میں دیرپا نشانات چھوڑ گئے ہیں۔ رومانی دور کی انفرادیت پرستی، اصل حقیقت سے فرار کر کے ایک زیادہ گوارا یا خوش آیند طلسماتی فضا کی تیاری نے ہمارے خوابوں میں رنگ بھرا اور امنگوں کی آرزوؤں اور مجبوریوں سے آگاہی بخشی، حقیقت پسندی کے دور نے ہمیں دور و نزدیک کی سچی زندگی اور اس کے مسائل کی شاعری اور فکر کا جلوہ دکھایا۔ یہ بیلے کا حسن ہے، سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور نازک آرٹ کا حسن۔

آج بھی وصل و فراق کی حکایتیں، درد و سوز کی شکایتیں، جبر و اختیار کی گتھیاں، حسن و عشق کی گھاتیں بیلے کے موضوع ہیں۔ "گرڈا گھوڑا" سروں پر اڑتا ہے، 'چینی بھگوان' نازل ہوتے ہیں، باغی مزدور پیرس کی گلیوں میں جلوس نکالتے ہیں۔ جھیل کے کنارے 'ہنس رانی' ازلی خواب سے جاگ اٹھتی ہے، اور عشق کا کرشمہ

اسے دنذوں کی دنیا میں لے آتا ہے، گڑیوں گڈّے رات گئے کھیل
تماشوں میں لگ جاتے ہیں، ایسی ایسی حیرت انگیز باتیں کرتے ہیں
جو صرف معصوم بچّے ہی سوچ سکتے ہیں، پہلے ناچ کے موقع پر ایک
شرمیلے سے لڑکے کا نذرانہ، تر و تازہ گلاب کسی لڑکی سے راستے ہیں
عرضِ مدّعا کر بیٹھتا ہے، 'سنڈریلا' کا سینڈل جھوٹے جنّات کے
منھ پر پڑتا ہے، تتلیاں پھولوں کے کان میں کچھ ایسی شرارت پھونک
جاتی ہیں کہ وہ سر دُھنتے رہتے ہیں، بہار چمن میں اتر پڑتی ہے اور
یوں لہراتی گزر جاتی ہے کہ گھاس کے نازک پتّیوں کے لب ہلنے نہیں
پاتے اور ایک ایک ٹہنی کے منھ پر آپ سے آپ رونق آجاتی ہے
پتھروں کی کٹی پھٹی چٹانوں میں اسے ایک سنگ تراش مزدور پتھر
کا پھول لیے نکل آتا ہے، اور افریقہ کی جنگ آزادی میں جھانجھ
کی جھنجھناہٹ اور پاؤں کی دھمک ہم آہنگ ہو جاتی ہے، شہرزاد
سالہا سال سے ادھوری کہانی سنائے چلی جا رہی ہے اور کوئی کہانی
نہ تمام ہوتی ہے نہ پرانی۔ بیٹھے ہیں انسانی خیالوں کی اس خلوت میں
شمعیں روشن کرکے بلا لیتا ہے اور یہ ہے اس کے رمز و علامت کا
جمال، یہ ہے اس کا کمال۔

انسانی تہذیب کے کتنے ایسے موضوع ہیں جو ہزاروں برس کی
گرد جھاڑ کر اُبھرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، ابھی کل کے ہیں۔ یہ پرانے
نہیں ہو سکتے، صرف وہ چوکھٹا پرانا ہو گیا ہے جن میں ان کو لگایا گیا تھا
قیس عامری ایک محمل کے ساتھ ساربان سے باتیں کرتا دوڑتا تھا لیکن
دو قبیلوں کی عداوت یا اس زمانے کے سخت گیر قانون نے دونوں محبّت
کرنے والوں کو ناکامی کی موت مرنے پر مجبور کر دیا۔ ایک کوہکن
نے وہی تیشہ اپنے سر میں مار لیا جس سے دودھ کی نہر نکالی تھی۔
رومیو اور جولیٹ کو محبّت میں موت کا سودا کرنا پڑا لیکن نہ مجنوں
کے عالم وحشت میں اور نہ فرہاد کے تیشے سے، بلکہ لڑ کر، اور اپنی راہ
پر چل کر، افریقہ کے کالے جوان اور گوری لڑکی کی محبّت کی راہ میں
بھی فولاد کی دیوار کھڑی ہے، مگر یہ وہ ہے جو نہ عربی شاعر کے
تخیّل میں تھی، نہ شکسپیئر کے انگلینڈ میں۔ ساریا اور لینی کھلے
بندوں ملتے ہیں (رات کے اندھیرے میں نہیں) اور اپنے حق
کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔

کہیں کارل مارکس نے کہا ہے کہ یک طرفہ محبّت کی ٹریجڈی
تو کمیونزم کے سماج میں باقی رہے گی، اس کا مداوا کوئی نہیں۔
کچھ عجب نہیں کہ دو طرفہ محبّت کی شادمانی کے ساتھ دو طرفہ محبّت
کے درمیان ٹریجڈی بھی ایک زمانے تک باقی رہے، بیلے کے فن کا
جادو، اس کی حقیقت پسندی یہ ہے کہ وہ ہر دور کی فتح مندی کے ساتھ
اس کے المیے کو یوں پیش کر دے کہ ماضی کا چوکھٹا ہمیں تصویر سے الگ
نظر آئے۔ ہم کل کی حقیقتوں کو آج کی حقیقتوں سے جوڑ کر زیادہ شدّت
کے ساتھ دیکھ سکیں۔ یوں تو یہ ہر ایک سچّی کلا کا دھرم ہے، لیکن
بیلے کا سب سے زیادہ، کیوں کہ سارے فنونِ لطیفہ کا مقطّر ملتا ہے
تو ایک اعلا درجے کا بیلے بن کر تیار ہوتا ہے۔

آج کل کا اگست ۱۹۶۴ کا شمارہ

اردو افسانوں کے لیے مخصوص ہوگا — جس میں ہندوستان کے تمام چوٹی کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہوں گی

رنگین سرورق اور دل کش تصاویر کے علاوہ افسانہ نگاروں کی تصاویر بھی رسالے کی زینت ہوں گی

قیمت — ایک روپیہ۔ سالانہ خریداروں کو یہ خاص نمبر چندے ہی میں ملے گا

•

ہمارے خاص نمبروں کی بعد میں بہت مانگ ہوتی ہے جسے ہم پورا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لہٰذا ایجنٹ حضرات اپنی زائد ضروریات سے
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی کو مطلع کریں

کرن سنگھ

آج کا کشمیر

ریاست جموں اور کشمیر حسین نظاروں اور دل کش منظروں کا دیس ہے اور تمام دنیا کے سیاحوں کے لیے ہمیشہ سے کشش کا باعث رہا ہے۔

وادیٔ کشمیر اپنے جھیلوں اور چشموں، مرغزاروں، باغوں، پوپلر اور چنار کے درختوں، بادام، چیری اور سیب کے باغوں کے لیے مشہور ہے۔ یہاں قسم قسم کے اور میٹھے پھل ہوتے ہیں۔ قدرتی چشموں کا پانی ٹھنڈا اور صحت بخش ہے یہاں شکاریوں کے لیے شکار بھی ہے اور فطرت کے پرستاروں کے لیے مسحور کن مناظر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان کے ہر کونے سے بلکہ تمام دنیا کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں کشمیر آتے ہیں۔

جموں اور کشمیر کا رقبہ ۸۴ ہزار مربع میل سے زیادہ ہے۔ گو کہ اس کا ایک حصہ دو حملہ آوروں، پاکستان اور چین کے ناجائز قبضے میں ہے۔ دو پڑوسیوں کے مسلسل جارحانہ رویے کے باوجود اس ریاست نے جمہوریہ ہند کے ایک لازمی حصے کی حیثیت سے گزشتہ برسوں میں زبردست ترقی کی ہے۔ حکومت کے جمہوری طریقوں اور ہوشیاری کے ساتھ معاشی منصوبہ بندی کی وجہ سے جو استحکام پیدا ہوا ہے یہ ترقی اسی کی مرہونِ منت ہے۔

کشمیر کی یہ حسین و جمیل وادی ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے اور سطح سمندر سے اس کی اوسط اونچائی ۵ ہزار فٹ ہے۔ اس کی لمبائی لگ بھگ ۸۴ میل اور چوڑائی ۲۰ سے ۳۰ میل ہے۔ چاروں طرف اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی یہ وادی ایسی لگتی ہے جیسے موتیوں سے جڑی ہوئی انگوٹھی میں نیلم کا کوئی ٹکڑا چمک رہا ہو۔ اس کے جنوب مغرب میں پیر پنچال کا پہاڑی سلسلہ ہے۔ جس پر پرانے زمانے میں ایک سڑک بنی ہوئی تھی جو مغل شہنشاہوں کی گزرگاہ تھی۔ چھوٹو

کا مرغزار گلمرگ اپنے مشہور گولف لنک، اسکیٹنگ کی ڈھلانوں اور پائن کے جنگلوں کے ساتھ یہیں واقع ہے۔ شمال مشرق میں پہلگام کی ذیلی وادی ہے جس سے لدر کا صاف شفاف پانی بڑی روانی اور زور کے ساتھ بہتا ہے۔ پہلگام سے آگے مشہور تیرتھ امرناتھ ہے جہاں ہزاروں یاتری جاتے ہیں۔ پوری وادی میں بہت سی خوب صورت جگہیں اور قدیم یادگاریں ہیں جو سیاحوں کے دلوں کو لبھاتی ہیں۔

دور دراز کے گاوؤں اور علاقوں میں سڑکوں کا جال سا بچھا ہے۔ اب سفر آسان ہو گیا ہے۔ دور افتادہ علاقوں میں نہ صرف نئے خیالات اور نئی باتیں پہونچتی ہیں بلکہ کاروبار کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔ گزشتہ برسوں میں کافی سڑکیں بنائی گئی ہیں اور اب ریاست میں چار ہزار میل لمبی پکّی اور کچّی سڑکیں ہیں۔ اور بہت سی سڑکیں بن رہی ہیں۔ اس کا معیشت پر بڑا دوررس اثر پڑا ہے۔ اب لگ بھگ سات ہزار موٹر اور ٹرک ریاست کے مختلف حصّوں میں چلتے رہتے ہیں اور ملک کے تمام حصّوں سے یہاں سامان لاتے اور کشمیر کی ہاتھ سے بنی ہوئی مشہور مصنوعات کشیدہ کی ہوئی چیزیں، پشمینہ، شالیں، قالین، نمدے، لکڑی اور چاندی پر خوب صورت کام، بنی ہوئی چیزیں اور قیمتی زیورات کو ملک کے دوسرے حصّوں میں لے جاتے ہیں۔

پھل پیدا کرنے پر خاص توجہ کی گئی ہے اور اس کا خاطر خواہ فائدہ ہوا ہے۔ اب لگ بھگ ۷ کروڑ روپے کا پھل ریاست سے ملک کے دوسرے حصّوں کو بھیجا جاتا ہے جس میں بڑی مقدار

آخروٹ کی ہوتی ہے ۔ آخروٹ کی دنیا کے بازاروں میں بڑی مانگ ہے ۔ آمدنی کا دوسرا ذریعہ جنگل ہیں ۔ ان سے اب ہر سال ۴ کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے جبکہ ۵۳-۱۹۵۲ء میں صرف ۷۰ لاکھ کی آمدنی ہوئی تھی ۔ جموں اور کشمیر کے جنگلات ریلوے کی سلیپر کی مانگ کو بڑی حد تک پورا کرتے ہیں ۔ ریاست میں ایسی صنعتیں بھی قائم کی جا رہی ہیں جن میں لکڑیاں کام میں آتی ہیں ۔

گزشتہ دہائی میں ریاست نے ہر لحاظ سے ترقی کی ہے ۔ یہ ہندوستان کی واحد ریاست ہے جہاں پرائمری سے لے کر اعلیٰ درجوں تک تعلیم مفت ہے ۔ اس وقت ریاست میں ۴ ہزار سے زیادہ پرائمری اور بیسک اسکول، ۲۴۶ ہائی اسکول، ۱۴ آرٹ اور سائنس کے کالج، ۷ انڈسٹریل ٹریننگ اسکول، ۴ مختلف پیشوں کی ٹریننگ دینے والے کالج ہیں جس میں ایک انجینیرنگ، ایک میڈیکل اور ایک ایگریکلچرل کالج شامل ہے ۔

عورتوں کی تعلیمی درس گاہوں میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے ۔ ٹیکنیکل تعلیم پر بہت زور دیا جا رہا ہے اور اس مقصد کے لیے طلباء کو بغیر سود کے قرض دیا جاتا ہے تاکہ وہ ہندوستان کے کسی دوسرے حصے میں یا غیر ملک میں جا کر اعلیٰ ٹیکنیکل تعلیم حاصل کریں ۔ اس کی وجہ سے ریاست میں تربیت پائے ہوئے نوجوانوں کی ایک نئی پود تیار ہو رہی ہے ۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ صحت عامہ اور قومی تعمیر و ترقی کی دوسری سرگرمیوں پر بھی پوری توجہ کی جا رہی ہے ۔ صحت پر فی کس خرچ ۵۰ پیسے سے بڑھ کر ۴ روپے سالانہ ہو گیا ہے ۔ بیماریوں کے انسداد کے لیے مختلف مہمیں چلائی گئی ہیں جس کی وجہ سے ٹائیفس کا تقریباً خاتمہ ہو گیا ہے اور ملیریا میں تیزی سے کمی آ رہی ہے ۔

سیاحوں کی آمد اس ریاست کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ سیر و سیاحت میں توسیع لانے کے لیے حکومت پوری کوشش کر رہی ہے ۔ سری نگر میں بڑا آرام دہ اور کشادہ ٹورسٹ سنٹر کھولا گیا ہے جہاں سیاح مناسب دام ادا کر کے ۲۴ گھنٹوں کے لیے قیام کر سکتے ہیں ۔ طویل قیام کے لیے ڈل جھیل اور دریائے جہلم میں آرام دہ شکارے موجود ہیں ۔

ریاست کی معاشی حالت میں زبردست تبدیلی آئی ہے ۔ پہلے اور دوسرے پنج سالہ پلانوں میں ۲۷۰۰ لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی گئی ہے جس کی وجہ سے تعمیر و ترقی کی کوششوں کو بہت بڑھاوا ملا ہے ۔ موجودہ پلان میں ۷۵۰۰ لاکھ روپے لگائے ہیں ۔ اوسط اور چھوٹے پیمانے کی بہت سی صنعتیں قائم ہو گئی ہیں ۔ ایک کارخانے میں آرائشی لکڑیاں، پلائی وڈ اور چپ بورڈ تیار ہو رہا ہے ۔ دوسرے کارخانے میں خوبصورت برتن تیار ہوتے ہیں ۔ سرکار نے سیمنٹ کا ایک کارخانہ کھولا ہے جس کی وجہ سے سیمنٹ کے معاملے میں وادی خودکفیل ہو گئی ہے ۔ ایسا ہی ایک کارخانہ صوبہ جموں میں بھی کھولا جا رہا ہے ۔ Prestressed Cement Concrete ایک کارخانے میں تیار ہونے لگا ہے ۔ ایک پائپ تیار کرنے کا کارخانہ تقریباً مکمل ہے ۔

کالاکوٹ کی کوئلے کی کانوں سے کوئلہ نکلنے لگا ہے ۔ یہاں ۲۵۰۰ کلوواٹ بجلی تیار کرنے کا ایک پلانٹ لگایا جا رہا ہے ۔ جموں کے نزدیک واقع ریاسی میں کوئلے کی کانیں غالباً شمالی ہندوستان کی واحد ثابت شدہ کوئلے کی کانیں ہیں ۔

بڑھتی ہوئی مانگوں کو پورا کرنے کے لیے بجلی کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا ہے ۔ اس وقت نصب شدہ صلاحیت ۳۱۰۰۰ کلوواٹ ہے جو ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں ۸ گنا زیادہ ہے ۔ ریاست کے آبی ذرائع سے بجلی پیدا کرنے کے لیے مختلف اسکیمیں زیر غور ہیں ۔ ریاست کی معدنی دولت سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لیے ۵ کروڑ کے سرمایے سے ایک کارپوریشن قائم کیا گیا ہے ۔ جموں اور کشمیر میں کوئلہ، لگنائٹ، جپسم اور تانبے جیسی معدنیات کافی مقدار میں پائی جاتی ہیں ۔ کشمیر کا نیلم دنیا بھر میں مشہور ہے ۔ اس کی کان کنی کا کام پھر شروع ہو گیا ہے ۔

زرعی ترقی کا اہم مسئلہ بھی نظر انداز نہیں ہوا ہے - زراعت کے معاملے میں تو انقلابی تبدیلی لائی گئی ہے - جن کے پاس ۲۳ - ایکڑ سے زیادہ کھیت تھے وہ ان سے لے کر اصل جوتنے والوں کو دے دئے گئے ہیں - بڑھیا بیج اور کیمیاوی کھاد کے استعمال کے ذریعے زرعی پیداوار بڑھانے کے اقدامات کیے گئے ہیں - کسانوں کو قرض سے متعلق کئی سہولتیں دی گئی ہیں تاکہ وہ کھیتی باڑی کے بہتر طریقوں کو اپنا سکیں - اجتماعی ترقی اور قومی توسیعی سروس کے پروگراموں کے ذریعے دھیرے دھیرے گاؤں کا نقشہ بدلتا جا رہا ہے - سیلاب کی روک تھام کے متعلق اعلیٰ اختیارات کے حامل ایک بورڈ کی اسکیموں کے ذریعے سیلاب کا خطرہ بھی رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے - ریاست کا ایک اہم حصہ لداخ جو اب تک پچھڑا ہوا تھا ترقی کی طرف قدم اُٹھا رہا ہے، وہاں ایک خاموش انقلاب آ رہا ہے اور اس حصے کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے -

ہندوستان کے ایک اٹوٹ حصے کی حیثیت سے کشمیر آج بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے اور اس کا مستقبل بڑا تابناک ہے - یہ سیکولرازم، مذہبی اور سماجی رواداری کی روشن مثال ہے جو مختلف عقیدوں پر مبنی سماج کے لیے بے حد ضروری ہے - چھوٹے پیمانے پر یہ پورے ہندوستان کی رنگا رنگی کا مظہر ہے کیونکہ اس کی حدود میں ہندو اور مسلمان، بودھ اور عیسائی، سکھ اور جین مل جل کر بڑی محبت کے ساتھ رہتے ہیں اور قومی تعمیر اور تیز رفتار معاشی ترقی ان کی زندگی کا مقصد ہے -

(آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ)

ایس۔ایم شاہنواز

رضاکارانہ رکت دان

ایک عام انسان خون کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا ہے کہ یہ ایک سرخ سیال ہے جو انسانی شریانوں میں رواں دواں رہتا ہے اور اس کا انسانی جسم میں وافر مقدار میں ہونا ضروری ہے۔ جب ہم کسی لاغر اور زرد پتے کی مانند جسم والے انسان کو دیکھتے ہیں تو متفقہ طور پر ہمارا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس انسان کے جسم میں خون کی کمی ہے۔ اس کے اسباب چاہے کچھ بھی رہے ہوں، لیکن اس انسان کے لواحقین اور معالج کی یہ پہلی کوشش ہوتی ہے کہ مناسب غذا اور دوا کے ذریعہ اس کے جسم میں خون کی پیداوار کو بڑھایا جائے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی زندگی کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے خون انتہائی ضروری ہے۔ یعنی خون ہی انسان کی زندگی ہے۔

بے شمار انسانوں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسا نازک لمحہ بھی آجاتا ہے کہ جب ان کے جسم میں خون کی بھیانک قسم کی کمی واقع ہو جاتی ہے اور اس کمی کو دوا یا غذا سے پورا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے لیے فوری طور پر خون کی ضرورت درپیش ہوتی ہے — سرخ اور تازہ انسانی خون۔ خون کی ضرورت صرف اسپتالوں میں موت سے کشمکش کرنے والے مریضوں کو ہی پیش نہیں آتی بلکہ زمانۂ جنگ میں اس کی ضرورت و اہمیت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

علم طب نے گزشتہ بیس برسوں میں اگر کوئی حیرت انگیز اور معجزہ نما دریافت کی ہے تو وہ صرف نقلِ خون (جسم میں خون پہنچانا) ہی ہے۔ ہمارے ملک میں یہ نام ابھی نیا ہے لیکن دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں اس عمل کو جو مقام حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ آپریشن، زچگی، اچانک حادثات، انیمیا اور جل جانے کی صورت میں خون کی فوری ضرورت ہوتی ہے اور اس نازک وقت میں نقلِ خون (Blood Transfusion) ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسانی زندگی کے بجھتے ہوئے چراغ کو بچایا جا سکتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ لاکھوں انسانوں کو موت کے منہ میں جانے سے بچانے کے لیے خون کہاں سے مہیا کیا جائے؟ جبکہ نہ تو خون کسی کارخانے میں بنایا جا سکتا ہے، نہ خون بنانے کا کوئی سائنسی و تکنیکی طریقہ ہے اور نہ ہی اس کی کھیتوں میں پیداوار ہو سکتی ہے۔ یہ اگر حاصل ہو سکتا ہے تو صرف تندرست و توانا انسانی جسم سے۔ لہٰذا خون دینے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر یقیناً ہمیں خود تیار ہونا پڑے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم رضاکارانہ رکت دان (Voluntary Blood Donation) کی سماجی اور طبی اہمیت کو سمجھیں۔

سماجی اور انسانی خدمات کے جدا جدا راستے ہیں اور مختلف شکلیں۔ اور ان کا اپنا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ رکت دان تحریک اس ٹھوس اعتقاد اور خدمت پر یقین رکھتی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہمارے زاویۂ نگاہ اور نظریات میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہونا لازمی امر ہے۔ لیکن ہمیں اس بات کا بھی احساس ہونا چاہیئے کہ یہ کام اتنا آسان اور سہل نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ فرسودہ اور غیر صحت مند خیالات، مبہم شبہات اور روایات کی دیواروں کو گرا کر ہمیں صدیوں سے چھائی ہوئی دھند سے

باہر نکلنا ہوگا ہم ہر معاملہ میں لکیر کے فقیر بنے رہ کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں سائنس کی ان بلندیوں کو چھونا ہی ہوگا، جو ہمارے ارادوں کو ایک حقیقی حوصلہ عطا کرکے تابناک مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ جہاں نئی زندگی ہے، نئی مسرتیں ہیں۔ ہم اب تک رضاکارانہ رکت دان کے معاملے میں وہم کا شکار رہے تھے، لیکن آج بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہہ سکتے ہیں کہ رکت دان تحریک قومی خدمت صحت کا ایک جزو لاینفک بن چکی ہے اور اس پر ہزاروں زندگیوں کا دار و مدار ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں رکت دان کی اہمیت و افادیت سرکاری، نیم سرکاری اور سماجی اداروں کے ذریعہ عوام پر ظاہر کی جاتی ہے۔ انھیں مختلف طریقوں سے رکت دان کرنے کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ انھیں اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ خون کے چند قطروں کے عطیات یک جا ہو کر ایک قیمتی انسانی زندگی کو وقت سے پہلے ضائع نہیں ہونے دیتے، جبکہ خون کے عطیات دینے والے افراد کے دل و دماغ اور جسم پر کوئی ناخوش گوار اثر نہیں پڑتا اور نہ ہی رکت دان کرنے سے انسان کی عمر کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس وہ خون دینے کے بعد تازگی اور ذہنی سکون محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہاں کے عوام بھی رکت دان کی سماجی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ جہاں ان پر دوسری سماجی ذمہ داریاں اور فرائض عاید ہوتے ہیں وہاں انسانی برادری کی فلاح کے لیے ایک رکت دان بھی ہے۔

رکت دان انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے اور انسانیت اس کے ذریعہ نئے رشتے جوڑنے میں مدد دیتی ہے۔ رکت دان کرنے والے کے دل میں انسانیت کے ناتے جہاں دوسرے لوگوں کی زندگی بچانے کے جذبات بیدار ہوتے ہیں وہاں نفسیاتی طور پر احساس کمتری کا جذبہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہی جذبات اور احساسات انسانی دل و دماغ کو منوّر کرتے ہیں اور یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس دنیا میں اس کی بھی کوئی اہمیت ہے۔ وہ بھی بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ اس قسم کے خیالات ایک ٹھوس اور موزوں شخصیت کی تکمیل کے لیے بہت ضروری ہیں۔ رکت دان ایک ایسا قومی پلیٹ فارم ہے جہاں ہر مکتب خیال کے لوگ منظم ہو کر اس فلاح و بہبود کے پروگرام کو عملی شکل دینے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ رضاکارانہ رکت دان سے سماج کی ایک بڑی مانگ پوری ہوتی ہے، کیونکہ یہ صحیح معنوں میں انسانیت پرست تحریک ہے جو نہ صرف ہماری سماجی زندگی کو سنوارے گی بلکہ ہمارے سوچ بچار کے انداز کو بھی نیا موڑ عطا کرے گی۔ اس سے ہر انسان کے دل و دماغ میں مساوات اور بھائی چارہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قومی یک جہتی کے سلسلے میں ہونے والے کاموں میں رکت دان اہم رول ادا کر سکتا ہے، کیونکہ نہ اس میں مذہب و ملّت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ رنگ و نسل کا۔ ہر خون دینے والا اور خون حاصل کرنے والا یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ نہ کوئی ہندو ہے اور نہ مسلمان، نہ کوئی سکھ ہے اور نہ عیسائی۔ سب انسانیت کے رشتے میں جڑے ہوئے ہیں۔

تعلیم اور بیداری ہی عوام میں کسی تحریک کی اہمیت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے عوام میں شعور پیدا ہوتا ہے اور یہی عوامی شعور کسی تحریک کو وسعت دینے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ صحتِ عامہ کے کاموں میں عوامی بیداری کوئی معمولی بات نہیں ہے کیونکہ اس کا اپنا ایک الگ طریقۂ کار اور تکنیک ہے۔ یوں تو ہمارے ملک میں اس سلسلے میں تعلیم و تشہیر کے ذرائع کی ابھی کافی کمی ہے۔ پھر بھی میں نے بہت سے لوگوں سے اس موضوع پر بات چیت کی ہے اور ان کے تاثرات و خیالات جاننے کی کوشش کی ہے۔ مجھے ان لوگوں سے سخت اختلاف ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں رضاکارانہ رکت دان تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی، ہندوستانیوں کے ذہن اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ابھی ہر ہندوستانی اس تحریک کی افادیت و اہمیت کو اچھی طرح نہیں سمجھ پایا ہے، لیکن گزشتہ سال جب چینی درندوں نے ہماری صدیوں سے پُرسکون رہنے والی سرحدوں پر حملہ کیا تو محاذِ جنگ پر زخمی ہونے والے بہادر سپاہیوں کی قیمتی زندگیاں بچانے کے لیے کافی مقدار میں خون کی ضرورت در پیش ہوئی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ وہ لوگ جو رکت دان کا نام سن کر ہی منہ بسورنے لگتے تھے اور عجیب مہمل نظریات کو اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھے تھے، ہزاروں کی تعداد میں بلڈ بنکوں اور بلڈ مراکز کے باہر قطاروں میں کھڑے نظر آئے۔ ہر ایک

کے دل میں ایک ہی جذبہ تھا کہ کسی نہ کسی بہادر کی رگوں میں اس کا بھی لہو دوڑے تاکہ اس نازک گھڑی میں ان کا فرض پورا ہو جائے ۔ کیا ان واقعات اور عوامی جذبات سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے ؟ قطعی نہیں ۔

ہمارے ملک میں معطی خون (Blood Donors) کی کمی نہیں ہے ۔ ہندوستانی عوام کی نس نس میں ایثار و قربانی کے جذبات رچے ہوئے ہیں ۔ ہماری تہذیب و تمدن کی اساس ہی ان جذبات پر قائم ہے ۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں ہونے والی کوششوں کو اجتماعی طور پر منظم کیا جائے ۔ ہمیں عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اس فرضِ عینی کے بارے میں ایک عام بیداری پیدا کرنی ہوگی اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ ہر اہلِ وطن کو یہ ذہن نشین کرا دیا جائے کہ وہ ایک عظیم کارِ خیر کی بنا پر اس اہم فریضہ میں حصہ لے رہا ہے ۔ ابتداً ہمیں رضاکارانہ رکت دان کی حمایت میں عوام کے خیالات کو ابھارنا پڑے گا اور ان کی تربیت کرنی پڑے گی ۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ خون کی ضرورت اور افادیت پر زور دیا جائے تاکہ ہندوستانی عوام قدیم روایات کے مطابق رضاکارانہ طور پر خون کے عطیات دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں آگے بڑھیں اور سسکتی ہوئی انسانی برادری کو ایک نئی زندگی ملے ۔

رکت دان کرنے کے سلسلے میں درج ذیل باتیں ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہئیں :

- ہر شخص جس کی عمر ۱۸ اور ۶۰ سال کے درمیان ہو ، رکت دان کر سکتا ہے ۔
- رکت داتی کا وزن ۱۱۰ پونڈ ہونا ضروری ہے ۔
- ایک صحت مند مرد ہر تین ماہ بعد بآسانی رکت دان کر سکتا ہے اور عورت چار مہینے بعد
- خون دینے میں دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا ۔
- رکت دان کرنے سے جسم کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا ۔
- کسی بیماری سے صحت یاب ہونے کے کافی عرصے بعد تک خون نہیں دینا چاہیئے ۔
- رکت دان کرنے کے بیس منٹ بعد آپ کام شروع کر سکتے ہیں ۔
- رکت دان کرنے سے پہلے چکنائی والی اشیاء استعمال نہیں کرنی چاہئیں ، جیسے کریم ، دودھ ، مکھن وغیرہ ۔

بھودان ، سمپتی دان اور جیون دان جیسے ایثار و قربانی کے اعلیٰ و ارفع مقاصد سے متاثر ہو کر ہمارا سماج عملی طور پر کچھ مزید قدم اٹھانا چاہتا ہے تاکہ رکت دان تحریک کو تقویت مل سکے اور اس عظیم انسانی تحریک کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت ہو سکے ۔ ہر سماجی و فلاحی کام کسی تحریک کی شکل میں اسی وقت پنپ سکتا ہے کہ جب ہم سب اپنے ذاتی مفادات کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی بھلائی کے لیے آگے آئیں اور اس مصمم ارادے کے ساتھ اس میں بھرپور حصہ لیں کہ راہ میں حائل ہونے والی تمام دشواریوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے گا ۔ اگر ہم یہ سوچ کر اس تحریک کو آگے لے کر بڑھیں تو ہمیں وہ روحانی مسرت حاصل ہوگی جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے ۔

ضروری گزارش

غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں ۔ (ادارہ)

ابدی نیند میں

روس کے وزراء کی کونسل کے پہلے نائب صدر شری الکسی کوسیجن عقیدت کے پھول چڑھا رہے ہیں

آخری سفر

اشاڑھ شک سمت ۱۸۸۶
جولائی ۱۹۶۴ء

آجکل

ہمارے نئے وزیرِاعظم ـــــ شری لال بہادر شاستری

ترتیب

سرورق:- دارجلنگ کا ایک بھوٹیا سازندہ (عکس شری بی۔ ان جتا)

رسالے کی پشت پر:- ۲۹ مئی ۱۹۶۴ء کی شام کو رام لیلا میدان میں شری نہرو کے سوگ میں ایک ماتمی جلسہ ہوا جس میں لاکھوں آدمیوں نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

جلد ۲۳ — نمبر ۱۲

اشاڑھ شک سمہ ۱۸۸۶

جولائی سنہ ۱۹۶۴ء

• مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل دہلی

سالانہ چندہ:-
ہندوستان میں:- سات روپے
پاکستان میں:- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے:- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ:-
ہندوستان میں:- ۶۰ پیسے
پاکستان میں:- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے:- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ گورنمنٹ ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ہمارے نئے وزیرِ اعظم

شری لال بہادر شاستری ۱۹۰۴ء میں ایک غریب کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ چھوٹے ہی تھے کہ ان کے پتا کا دیہانت ہو گیا۔ ان کے والد ایک معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ پتا کی موت کے بعد ان کے لیے تعلیم حاصل کرنا مشکل ہو گیا لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری اور سخت مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ حتیٰ کہ بعض اوقات وہ ندی تیر کر پار کرتے اور اسکول جاتے، کیونکہ کشتی کا کرایہ ادا کرنے کے لیے ان کے پاس پیسے نہ ہوتے تھے۔

تقریباً اٹھارہ سال کی عمر میں انھوں نے سیاست میں حصّہ لینا شروع کیا۔ مہاتما گاندھی نے لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ اسکول، کالج اور اپنی ملازمتیں چھوڑ کر ان کا ساتھ دیں۔ شاستری جی نے اس اپیل پر لبیک کہتے ہوئے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ بعد میں ایسے ہی دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ کاشی ودیا پیٹھ بنارس میں پڑھنے لگے جہاں ان کی ملاقات آچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر بھگوان داس، ڈاکٹر سری پرکاش، ڈاکٹر سمپورنانند سے ہوئی۔ یہیں سے انھوں نے شاستری کا امتحان پاس کیا جو ان کے نام کا ایک لازمی جزو بن گیا۔

آئندہ برسوں میں سیاست سے ان کا گہرا تعلّق ہوتا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں ان کی ملاقات لالہ لاجپت رائے سے ہوئی جو اس وقت سرونٹس آف پیوپل سوسائٹی کی تنظیم کر رہے تھے۔ شاستری جی اس سوسائٹی میں شریک ہوئے اور اس کی طرف سے انھیں الٰہ آباد کام کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ یہیں ان کی ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ سوسائٹی نے انھیں ہریجنوں کے درمیان کام کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس طرح ان کا تعلق کانگریس سے بھی ہو گیا۔ جس کا مرکز ان دنوں آنند بھون تھا۔ اپنے اچھے کام کے باعث وہ سٹی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری اور پھر الٰہ آباد ضلع کانگریس کے سکریٹری اور صدر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ یو۔پی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جنھیں ۱۹۴۱ء میں انفرادی ستیہ گرہ کے لیے چنا گیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب کانگریس نے یو۔پی میں عنانِ حکومت سنبھالی تو وہ وزیرِ اعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت کے پارلیمانی سکریٹری چنے گئے اور ایک سال کے اندر وزیرِ پولیس بنا دئے گیے۔

۱۹۵۱ء میں جب وہ ۴۷ سال کے تھے انھیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ پھر وہ کانگریس پارلیمنٹری بورڈ میں لے لیے گیے اور ہر اہم معاملے میں ان کی رائے لی جانے لگی۔

۱۹۵۲ء کے عام انتخابات کے بعد وہ مرکز میں ریلویز کے وزیر بنا دئے گئے۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں محبوب نگر میں ریلوے کا حادثہ پیش آیا اور انھوں نے اس کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے استعفا دے دیا۔ حکومت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جانے کے بعد انھیں نہایت اہم کام سونپا گیا اور ۱۹۵۷ء کے عام انتخابات کے چیف آرگنائزر بنا دئے گیے۔

۱۹۵۷ء میں وہ پھر مرکزی کابینہ میں شامل ہوئے اور وزیر نقل و حمل اور رسل و رسائل اور صنعت و تجارت کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۱ء میں وزیرِ داخلہ بنا دئے گیے اور ۱۹۶۳ء تک اس عہدے پر رہے اور کامراج پلان کے تحت استعفا دے دیا۔

بھونیشور میں پنڈت نہرو کی علالت پر وزارت میں واپس آ گئے۔ انھوں نے اپنے ناخنِ تدبیر سے کئی مشکل گرہیں کھولیں۔ جن میں ہند نیپال دوستی کی تجدید اور کشمیر میں موئے مبارک کی گم شدگی کے زمانے میں ان کی دور اندیشی و تدبر قابلِ ذکر ہے۔

وہ بڑے سادہ اور منکسر المزاج ہیں اور ہمیں پوری امید ہے کہ وہ اپنی بھرپور کوششوں سے ملک کو خوش حالی کی طرف لے جائیں گے۔

اے مادرِ ہند

(رُباعیات)

(۱)

اے مادرِ ہند صبح تیری تری شام ہیں ساقیٔ دوراں کے چھلکتے ہوئے جام
لمحوں میں ترے رازِ ابد پنہاں ہیں تیری ہر سانس ایک پیغامِ دوام

(۲)

دریا آئینۂ جہاں گذراں کہسار ترے سکونِ دائم کے نشاں
ہے تیری فضا میں کچھ گھلاوٹ ایسی افزوں جو کرے رقّتِ قلبِ یزداں

(۳)

حور و غلماں حسنِ ہندی کی صفت گلزارِ جناں میں ترے رنگ و نکہت
ندیوں کا تری نچوڑ نہرِ کوثر مٹّی میں ہے تری شانِ ارضِ جنّت

(۴)

انسان کو انسان بنایا تو نے وجدان کو وجدان بنایا تو نے
ہر فن کو آئینۂ حقیقت کا کیا ہر علم کو عرفان بنایا تو نے

(۵)

شانِ رم زندگی اداؤں میں تری پیچ و خم زندگی کلاؤں[1] میں تری
موسیقیٔ سیّال لب و لہجہ ترا کیف و کم زندگی صداؤں میں تری

(۶)

بادل کا دھواں برفِ سرِ کہسار جلوہ وہ دیولوک دشت و گلزار
گاتی ہوئی اپسرائیں جیسے گذریں ندیوں نے تری وہ چھیڑ رکھا ہے ستار

(۷)

وہ اِندر دھنش وہ سانجھوں کی بہار بہروپ دکھاتے موسموں کی رفتار
آجاتی ہے جھنکار تری پائل کی اک رقص مسرّی ہے یا رتِ سنگھار

[1] فنونِ لطیفہ

(۸)

رخساروں میں تیری ہی دمک دیکھتے ہیں ہر عضو میں تیری ہی لچک دیکھتے ہیں
پڑتی ہے آنکھ اپنی جب خلقت پر ہر چہرے میں تیری ہی جھلک دیکھتے ہیں

(۹)

دن رات کھنک رہے ہیں لاکھوں ہی تار کانوں میں ازل سے آ رہی ہے جھنکار
افلاک بریں پہ انگلیوں نے تیری لو دیتے ہوئے تاروں کا چھیڑا ہے ستار

(۱۰)

تیری ہر سانس میں جناں کی بُو باس دامن کی ہوا ترے زمانے کو ہے راس
حاصل ہوا دھڑکنوں سے تیرے دل کی روحانیتِ مادّہ کا یہ احساس

(۱۱)

ہر فرقہ و ہر ملّت و ہر مذہب و دیں سب نے جائے پناہ پائی ہے یہیں
اولاد میں ممتا جھلکتی ہے تری دنیا کی مادرِ وطن ہے یہ زمیں

(۱۲)

پھیری ترے در کی جو لگا جاتے تھے سینے کی دبی جوت جگا جاتے تھے
سنتے ہیں علاوہ دولتِ دنیا کے سائل ترے کچھ اور بھی پا جاتے تھے

(۱۳)

کیا کیا ہمیں دے گئے ہمارے اجداد کیا کیا ہمیں کر گئے وہ شاد و ناشاد
دی دولتِ بیدار رموزِ ہستی گہری ہے نشاط و غم سے جن کی بنیاد

(۱۴)

پیغام ترا بات اٹل ہے اے ہند ہر دور ترا ایک ہی پل ہے اے ہند
شاموں پہ تری شامِ ابد کا سایہ ہر صبح تری صبحِ ازل ہے اے ہند

(۱۵)

لے اے ماتا نظامِ شمسی کا سلام — دے اے ماتا نظامِ شمسی کو پیام
اے ہند ترا نزول عالم میں ہے — سینے میں فضاؤں کے خدا کا الہام

(۱۶)

وہ سیاروں کے آنے جانے کی صدا — وہ قلبِ زماں کے تھرتھرانے کی صدا
پہلی آواز تھی زمانے میں تری — کہتے ہیں جسے الکھ جگانے کی صدا

(۱۷)

دل سانچوں میں نوا کے ڈھل جاتے تھے — آتش نفسی کے لوگ بل جاتے تھے
ظلمات کے سینے میں بقولِ راوی — سانسوں سے تری چراغ جل جاتے تھے

(۱۸)

تو ہی نے کھلائے ہیں حقائق کے وہ پھول — بیٹھی اب تک نہ جن پہ قرنوں کی دھول
تاریخ بشر ہے خیر و برکت تیری — تہذیبِ جہاں کا تو امام و رسول

(۱۹)

یہ تیرا سکوت ہے کہ بنتے ہوئے بول — ہے جام جہاں نما کہ تیرا کشکول
اک چٹکی بھبھوت ہے شفائے ہر درد — ہے خاک تری کہ کیمیا ہے انمول

(۲۰)

انسان کی تقدیر بنا دیتی ہے — ہر آہ کو تاثیر بنا دیتی ہے
پہلو میں ترے دبی ہوئی ہے وہ آنچ — جو درد کو اکسیر بنا دیتی ہے

(۲۱)

دیکھا نہیں آنکھوں نے ترا کومل گات — ہیں تیرے گواہ زندگی کے لمحات
تو ایک وجودِ غیر مرئی کی طرح — رہتی ہے ہمارے ساتھ دن ہو یا رات

(۲۲)

ہر غنچہ و گل جام و سبو ہے تیرا — اولاد تری جوشِ نمو ہے تیرا
ہر اہلِ وطن کو تو نے پالا پوسا — اس قوم کی رگ رگ میں لہو ہے تیرا

(۲۳)

ہے تیرے گداز دل میں ایسی شفقت — جوبن کے چھلکتی ہی ہے خیر و برکت
ساوتری و سیتا کی قسم کھائے ہوئے — ہے اب بھی زنِ ہند میں اک دیویت

(۲۴)

کنیائیں ازل کی ہے صبا جن میں — رادھا کی اداؤں کی ہے نزاکت جن میں
تو آج بھی جن رہی ہے ایسے بچے — ہے کرشن کی شوخی و شرارت جن میں

(۲۵)

شعلے سے جبینوں سے لپک جاتے ہیں — مرجھائے ہوئے چہرے دمک جاتے ہیں
اُن چہروں میں جن پر ہے اٹی گردِ ملال — رُخ بھیشم و ارجن کے جھلک جاتے ہیں

(۲۶)

اک نغمہ ہوا اب بھی سنا جاتی ہے — اک آگ سی سینوں میں لگا جاتی ہے
ہاں آج بھی سنسناتی ہوئی بانسواڑیوں سے — بنسی والے کی تان آ جاتی ہے

(۲۷)

وہ تیرے رزمیوں کی دنیائے عظیم — وہ دھرم اور نیتی کے ہزاروں ہی کلیم
جو آنکھوں میں زندگی کی ڈالیں آنکھیں — جو بس میں کریں سب کے رچا ہو کہ ہو بیم

(۲۸)

ہے تیری قدامت میں بھی برنائی سی — اسرارِ نمو سے ہے شناسائی سی
وہ لوچ ہے زاویوں میں فکر و فن کے — لیتا ہے دوام جن میں انگڑائی سی

(۲۹)

ہر فنِ لطیف کی وہ نوعیت ہے — نشترزدِ وجدان وہ شعریت ہے
ان دیکھی حقیقتوں نے صورت پکڑی — کتنی دل کش یہ قلب ماہیت ہے

(۳۰)

بیداری چشمِ غیب کی ہے جو مثال — دیکھا ہے ترے فن کاروں نے وہ خوابِ جمال
جو قلبِ حقیقت سے چھلک جاتا ہے — شاداب اسی لہو سے رگ ہائے خیال

(۳۱)

ہر نقشِ اجنتا کا وہ چلتا جادو — وہ حسن و جمال کے بدلتے پہلو
وہ بت سازی کہ جان پتھر میں پڑے — ہے تاج کہ رخسارِ زماں پر آنسو

(۳۲)

پہونچے ہیں کہاں کہاں یہ تیرے فن کار — شو کا تانڈو ہے یا ہے نٹ راج سنگھار[1]
پیشانی شو دمِ ہلاہل نوشی — وہ ابروؤں پر چڑھی کمانوں کا اتار

[1] شو کا وہ رقص جو خاتمۂ کائنات یا قیامت کا رقص ہے۔

(۳۳)

فطرت کی خلوتوں میں ڈالے ڈیرے   پیچ و خم زیست کے لگائے پھیرے
دنیا کے کتب خانوں سے جو نہاں تھے   وہ راز کھلے ہیں جنگلوں میں تیرے

(۳۴)

مانا ترے فرزند بھرت کا کردار   وہ تخت و تاج چھوڑنے کا ایثار
رمتے ہوئے رام کی غریب الوطنی   ٹھوکر سے قدم کی وہ اہلیا ادھار

(۳۵)

تہذیب کی پہلی صبح کی پاک دعائیں   گونجی ہوئی ہیں فضا میں رشیوں کی صدائیں
اے گنگ و جمن کی گنگناتی لہرو   دیتی ہیں سنائی تم میں ویدوں کی رچائیں

(۳۶)

وہ تیرے مفکروں کا قلب ہشیار   پلکوں میں جن کی بند روح بیدار
وہ جین اور بدھ مت کی غائر نظری   انکار کو کر دیا ہے رشک اقرار

(۳۷)

بے فائدہ ہے عارضی حالات کی ڈینگ   بے کار عبور بحر ظلمات کی ڈینگ
اے تو کہ ہے فاتح قلوب اقوام   نظروں میں تری ہیچ فتوحات کی ڈینگ

(۳۸)

شاعر ترے جس وقت صدا دیتے ہیں   سوئے ہوئے سینوں کو جگا دیتے ہیں
آفاق کے مندروں میں وہ نغمے ان کے   رہ رہ کے گھنٹیاں بجا دیتے ہیں

(۳۹)

ان راگوں کا راز کوئی پوچھے ہم سے   افلاک کھنکتے ہیں تال اور سم سے
مٹی تری اے ہند ہے نرمائی ہوئی   سیتا و شکنتلا کے اشک غم سے

(۴۰)

یہ دور خزاں جلد گزر جائے گا   پھر وقت لیے برگ و ثمر آئے گا
ہر اشک رواں قاصد مستقبل ہے   پھر اچھے دنوں کی وہ خبر لائے گا

(۴۱)

آغوش ملائم میں سلایا ہم کو   خاموش آواز سے جگایا ہم کو
کچھ ہم بھی بنائیں ترے بگڑے ہوئے کام   اے خاک وطن تو نے بنایا ہم کو

(۴۲)

یہ رات مصیبت کی ہے کٹنے والی   یہ کالی گھٹائیں ہیں اب چھٹنے والی
ہیں وقت کے اوراق الٹنے والے   پھر ہے تری تقدیر پلٹنے والی

(۴۳)

دل میں ترے ہے آج کیا کیا سنکوچ   دست و پا میں ہیں خار زاروں کے کھروچ
پھر مانگ رہا ہے دور حاضر کا گھاؤ   وہ نرم روی وہ تری رفتار کا لوچ

(۴۴)

ہر غم کا ترے رنج و الم ہے ہم کو   معلوم ترا بھید بھرم ہے ہم کو
اجڑے گی نہ کوکھ تیری اے مادر ہند   ہاں تیرے سہاگ کی قسم ہے ہم کو

(۴۵)

قومیں ہیں بیسیوں ہی مگر ایک مزاج   نسلیں ہیں بیسیوں ہی مگر ایک سماج
ہے وسعت قلب ذرے ذرے میں ترے   یعنی تری خاک ہر تعصب کا علاج

(۴۶)

وہ دیکھ نئی صبح کی پو پھوٹتی ہے   وہ دیکھ کہ نبض شب غم چھوٹتی ہے
وہ دیکھ بکھرتے چلے اشک انجم   وہ دیکھ کہ زنجیر فلک ٹوٹتی ہے

(۴۷)

پتھر جو راہ میں ہیں ہٹ جائیں گے   سنگین جگر کوہ کے پھٹ جائیں گے
تیشے وہ کئی کروڑ ہاتھوں نے اٹھائے   اب پاپ جنم جنم کے کٹ جائیں گے

خراجِ عقیدت

۲۹-مئی ۱۹۶۴ء کو رام لیلا گراؤنڈ دہلی میں ایک عام جلسہ ہوا جس میں ہندوستان اور باہر کے ملکوں کے اکابر نے مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ذیل میں صدرِ جمہوریہ ہند اور نائب صدر جمہوریہ ہند کا خراجِ عقیدت درج ہے۔

راشٹرپتی ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن

دوستو! ہم بیرونی ملکوں سے تعزیت پیش کرنے کے لیے آنے والے مہمانوں کے ممنون ہیں جو ہماری تاریخ کی اس غم ناک گھڑی میں ہمارے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کے لیے آئے اور ہمیں ڈھارس دی۔ اس موقع پر ان کی پرسش سے ہم بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ جواہر لال نے صرف بھارت ہی کی نہیں بلکہ ساری انسانیت کی خدمت کی ہے۔

ایٹمی سائنس کی ایجادوں کے بھیانک نظارے سے انھوں نے محسوس کیا کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن جس کا مقابلہ کرنا ہے وہ جنگ ہے۔ اس لیے انھوں نے پُرامن بقائے باہم، تعاون، ناوابستگی وغیرہ کے اصولوں کے ذریعہ قوموں کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا کرنے کے لیے کوشش کی۔ تمام جھگڑے غلط فہمی سے پیدا ہوتے ہیں اور مفاہمت پیدا کر کے ہم ان جھگڑوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمیں جو دھکا پہونچا ہے وہ مہاتما گاندھی کی وفات کے بعد سب سے بڑا دھکا ہے۔ وہ ان تمام آدرشوں کو عمل میں لانے کے لیے کوشش کر رہے تھے جو ہمیں مہاتما گاندھی نے سکھائے ہیں۔ آپ جانتے ہیں۔ مہاتما جی نے کہا تھا "میں ہر انسان کی آنکھ سے آنسو پونچھنا چاہتا ہوں۔" جواہر لال اس قول کو بار بار دہراتے تھے اور ہمارے سماجی نظام میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے استعمال سے انھوں نے ہمارے عام انسانوں کے دکھ درد کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس بات کی کوشش کی کہ ہمارے عوام محسوس کریں کہ وہ ہمارے سماج کے مکمل طور پر اوّل درجہ کے شہری تسلیم کیے جا رہے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ بڑی شدّت سے یہ محسوس کرتے تھے کہ افراد کی طرح قوموں کو بھی اخلاقی اصولوں کو ماننا چاہیئے۔ انھیں اخلاقی ذمہ داریوں کی قدر کرنی چاہیئے۔ وہ تمام قاعدوں سے بالاتر نہیں ہو سکتے۔ انھیں خود کو قوانین کے تحت سمجھنا چاہیئے۔

ایک ریاست کو اچھے بُرے کی اخلاقی تمیز ہونی چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ ریاست دولت جمع کر سکتی ہے، غیر معمولی طاقت والے اسلحہ بنا سکتی ہے لیکن آخر میں اس کا خاتمہ یقینی ہے۔ یہی سبق انھوں نے ہمیں دیا ہے۔ ایک شلوک میں کہا گیا ہے کہ اگر ہم دھرم کی حفاظت کریں تو دھرم ہماری حفاظت کرے گا۔ اگر ہم دھرم کو نظر انداز کرتے ہیں تو دھرم بھی ہمیں نظر انداز کرے گا۔ چیزوں کی فطرت کا یہ ایک قاعدہ ہے اور یہ تقاضا ہے کہ ہم سب قومی مفاد تک کے بارے میں بھی کچھ اعتدال سے کام لیں۔

خود جواہر لال نہرو نے ۱۴-اگست ۱۹۴۷ء کے تاریخی دن کے موقعہ پر کہا تھا "میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ جب تک ہم لوگ کچھ خاص اخلاقی اصولوں کو نہ اپنائیں ہم اپنی قدیم عظمت دوبارہ حاصل نہیں

کر سکتے۔

انھوں نے کہا تھا کہ اپنے ذاتی مفاد کے مقابلہ میں قوم اور انسانیت کے مفاد کو بالاتر رکھنا ہے۔ ہمیں آج اس عہد کا اعادہ کرنا ہے۔ یہی ایک واحد طریقہ ہے جس سے ہماری قوم ترقی کر سکتی ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ جواہرلال نہرو کو اپنا خراج عقیدت ہی پیش نہیں کریں گے۔ ان کے لیے کسی خراج عقیدت کی ضرورت نہیں ہے۔ جدید بھارت جس کی انھوں نے ایک ایک اینٹ چنی خود ان کے لیے عظیم الشان اور پائیدار یادگار ہے۔

ہم ان عظیم آدرشوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے جن کے حصول کے لیے انھوں نے آرام حرام کر دیا تھا اور ہمیں نئے بھارت کی تعمیر میں آگے بڑھنا ہے۔

اُپ راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین کی تقریر

آپ اور ہم سب یہاں اکٹھا ہیں۔ آپ اور ہم جانتے ہیں کہ یہاں بہت دفعہ بڑے بڑے جلسے ہوئے ہیں۔ اس منچ سے لوگوں نے بڑی بڑی تقریریں کی ہیں۔ بھاشن دئے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا آپ یہاں ہزاروں کی تعداد میں ان جلسوں میں آتے تھے اور ایک آدمی یہاں اونچی میز پر بیٹھ کر آپ سے گھنٹوں باتیں کرتا تھا۔ آپ کو بتاتا تھا کہ دیش میں کیا ہو رہا ہے۔ آپ سے کہتا تھا کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ آپ کچھ سمجھتے تھے اور کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اس کو دیکھ کر آپ کو طاقت پہونچتی تھی۔ اس کو دیکھ لینے سے آپ یہ سمجھتے تھے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ کرنا ہے وہ یہ کرے گا۔ جو یہ کہتا ہے اس پر چلنا چاہیئے۔ آج آپ کی آنکھیں اس کو یہاں ڈھونڈتی ہوں گی۔ وہ تو چلا گیا۔ آپ اسے کبھی یہاں نہیں دیکھ سکیں گے۔ کل ہم نے اس کے بدن کو شعلوں کے سپرد کر دیا۔ وہ خاک ہو گیا۔ لیکن ان تین دنوں میں ہمارے دیش میں کوئی آنکھ نہیں ہوگی جس سے آنسو نہیں روئے ہوں گے۔ کوئی دل نہیں ہوگا جو سسکا نہیں ہوگا۔ کسی کو ایسا لگتا ہے کہ اس کا باپ مر گیا کسی کو ایسا لگتا ہے کہ بھائی چلا گیا، کسی کو ایسا لگتا ہے کہ دوست چلا گیا۔ اور سب کو ایسا لگتا ہے کہ ان کا پیارا، ان کا محبوب چلا گیا۔ اس لیے کہ جو آدمی چلا گیا ہے اس نے اپنی ذات میں ایسی اچھائیاں جمع کر لی تھیں، ایسی خوبیاں اکٹھی کر لی تھیں کہ ایسا لگتا تھا کہ وہ سب کا محبوب ہے۔ ہم سب کا پیارا ہے۔ اس پر جان نچھاور کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اسے دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کر لیتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو ہمارا بھلا چاہنے والا ہے۔ اس کے پاس بیٹھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی اچھی چیز کے پاس بیٹھے ہیں۔ اس سے دل کو تقویت ملتی تھی۔

وہ چیز تو چلی گئی۔ اب نہیں مل سکے گی۔ لیکن ایک چیز ہے جو نہیں گئی۔ اور وہ چیز ہے جس نے پنڈت نہرو کو ہمارا محبوب بنایا تھا اور جن کی وجہ سے ہمارا دل ان پر آیا تھا۔ جن کی وجہ سے ہم ان کو دیکھنے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ وہ چیز اس دیش کی سیوا تھی۔ اس کو بڑا بناتا تھا۔ اس میں ایکا پیدا کرتا تھا۔ اس کے سوئے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑ کر جگاتا تھا۔ ایسے لوگوں کو جو پرانے ڈھنگ سے اپنی روزی کمانا چاہتے تھے ان کو نئے ڈھنگ پر چلانا چاہتا تھا۔ نئے طریقوں سے چیزیں پیدا کرنا سکھاتا تھا۔ کھیتی کے نئے طریقے بتاتا تھا۔ نئی یوجنائیں بنائی تھیں اور اس دیش کی کایا پلٹ دینی تھی۔

ایسا آدمی چلا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ سناٹا ہو گیا ہے۔ اس دلّی کا ایک شاعر تھا غالب، اس نے کہا تھا ؎

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

تو آج ہی یہ اداسی ہم پر چھائی ہے۔ مانا کہ یہ اداسی صحیح ہے اور ہم اس سے بھاگ نہیں سکتے۔ لیکن پنڈت جواہرلال نہرو کو اپنے دلوں میں زندہ رکھنا ہے۔ ان کو امر بنانا ہے۔ کل جب ان کی ارتھی اُٹھ رہی تھی تو ہمارے بچے اسکولوں میں پڑھنے والے بچے پکار رہے تھے "چاچا نہرو امر ہیں"! تو ہم سب کی پکار ہونی چاہیئے کہ وہ کیسے امر ہوں گے۔ وہ ہمارے دلوں میں امر ہوں گے ہمارے جیون میں امر ہوں گے۔ ہمارے کام سے امر ہوں گے۔ ہمارے دیش کی ترقی سے امر ہوں گے۔ اور اگر ہم یہ نہ کر سکیں گے تو ایسا ہوگا کہ ہم نے ان کو مار ڈالا۔ آپ میں سے کون ان کو مارنا چاہے گا۔ وہ زندہ رہ سکتے ہیں وہ امر رہ سکتے ہیں لیکن وہ آپ

کے دلوں میں ہو سکتے ہیں۔ آپ کی محبت اور محنت سے ہو سکتے ہیں۔

اس لیے اب آنسو بہانے کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ آنسو سوکھ بھی جاتے ہیں۔ بہتے ہیں اور بہتے ہیں اور پھر سوکھ جاتے ہیں۔ ہمارے آپ کے آنسو بھی سوکھ جائیں گے لیکن دل کی گرمی کو بجھنے نہیں دینا چاہیئے۔ ارادے کو مضبوط رکھنا چاہیئے اور آگے زندگی کو اچھی طرح چلانا چاہیئے۔ ہم سب کو آپ کو جاننا چاہیئے کہ سب سے بڑی بات آپ کا اتحاد ہے۔ پنڈت نہرو نے اور ان سے پہلے ان کے گرو مہاتما گاندھی نے ہماری جیون کی جڑ کو اس طرح لو یا تھا کہ جب تک ہم میں ایکا نہیں ہوگا ہم اچھی زندگی نہیں گزار سکیں گے۔ اس ایکتا کے لیے آپ اپنے دل میں فیصلہ کر لیجیے کہ کسی ہندوستانی کا ہاتھ چاہے وہ ہندو کا ہو، مسلمان کا ہو، چاہے وہ سکھ کا ہو یا پارسی کا ہو کسی دوسرے ہندوستانی پر نہیں اٹھے گا۔ اگر اٹھے گا تو اسے روکنا ہوگا۔ پنڈت نہرو کے نام پر روکنا ہوگا۔ مہاتما گاندھی کے نام پر روکنا ہوگا۔ اس دیش کے ہر باسی کو عزت کے ساتھ، آبرو کے ساتھ، بھائی کے ساتھ دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ اور اس کی ذمہ داری ہم پر، آپ پر، سب پر ہے۔ ہم یہ نہیں کر سکیں گے تو پنڈت نہرو مر جائیں گے۔ ہم یہ نہیں کر سکیں گے تو گاندھی جی بھلا دیے جائیں گے۔ ہمیں تو اس دیش کو ایک بنانا ہے۔ اس کے دیش باسیوں کو بھائی بھائی بنانا۔ ان میں محبت اور پریم پیدا کرنا ہے۔ ان میں جو نفرت ہے اس نفرت کی آگ کبھی کبھی لگ جاتی ہے یا لگا دی جاتی ہے، اس کو ہر طرح سے بجھانا ہے۔ یہ آپ کریں گے تو سب کام ہوتے رہیں گے اور حکومت کا کام ٹھیک چلے گا۔ یوجنائیں بنیں گی، بڑے بڑے کارخانے بنیں گے۔ لیکن یہ سب ناکارہ ہو جائیں گے، بے کار ہو جائیں گے، اگر ہم میں ایکتا نہیں ہوگی۔ اگر ہم مل جل کر کام نہیں کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ ان کے نام پر، ان کے گرو مہاتما گاندھی کے نام پر آپ اپنے دلوں کو مضبوط کریں گے۔

عقیدت کے دو پھول میں بھی چڑھاتا ہوں۔ آپ نے بھی چڑھائے ہیں اور میں کیا چڑھا سکتا ہوں۔ لیکن اگر ہم یہ عہد کر لیں، پکی نیت کر لیں تو ہم کھوئی ہوئی ہمت حاصل کر لیں گے۔ زندگی میں ایک کمی ہمیشہ رہے گی۔ لیکن اس کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

سید محمود

جواہرلال نہرو

(کچھ یادیں)

پنڈت جواہرلال نہرو سے سب سے پہلے میری ملاقات ۱۴- نومبر ۱۹۰۹ء کو کیمبرج یونین میں ہوئی - اس وقت مجھے نہیں علم تھا کہ ۱۴ نومبر ان کی پیدائش کا دن ہے - کیمبرج کے انڈرگریجویٹ طلباء کے درمیان وہ گلابی رنگ کی قمیض اور اسی رنگ کی ٹائی اور اس سے میل کھاتا ہوا موزہ پہنے ہوئے تھے - اپنی سال گرہ کی وجہ سے غالباً ایک نیا سوٹ بھی زیب تن کیے ہوئے تھے - دھیمی اور میٹھی آواز میں گفتگو کرتے رہے - ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ گویا وہ انگریزی سوسائٹی کے اپر مڈل کلاس کے آدمی ہیں - اس سے پہلے وہ کئی سال تک ہیرو میں پڑھ چکے تھے - غالباً اسی وجہ سے ان پر اپر مڈل کلاس سوسائٹی کا اثر تھا - اس وقت بہت تھوڑی گفتگو رہی - کسی خاص موضوع پر بات چیت نہیں ہوئی تھی بلکہ انگریزی تہذیب کے مطابق پہلی ملاقات عام رسمی گفتگو تک محدود رہی - معلوم نہ ہونے کی وجہ سے میں انھیں ان کی سال گرہ کی مبارک باد بھی نہ دے سکا - کوئی خاص اثر اس وقت مجھ پر نہیں ہوا - مگر پھر بھی آواز اور صورت میں ایک کشش تھی اور اس کشش کا اثر یہ ہوا کہ میں نے اس مختصر ملاقات کو اپنی اس دن کی ڈائری میں درج کر لیا - اس زمانے میں مجھے ڈائری لکھنے کی عادت تھی -

اس کے بعد کچھ عرصے تک ملاقات نہ ہوئی - کبھی کبھی جب کہیں اُن پر نظر پڑ جاتی تو ہم ایک دوسرے کو سلام کر لیتے اور مزاج پرسی کر لیتے لیکن میں نے اس وقت محسوس کیا کہ میری کشش بڑھتی جا رہی ہے اور ایک غیر محسوس طریقے پر میں ان کی طرف کھنچ رہا ہوں - میں نے بعض دوسرے دوستوں سے جن سے ان کی اچھی ملاقات تھی ان کا کئی بار ذکر کیا اور مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے بھی میرا ذکر اوروں سے کیا - کبھی کبھی کیمبرج انڈین مجلس میں ملاقات ہو جاتی تھی مگر کوئی گفتگو مجھے یاد نہیں -

کچھ عرصے کے بعد وہ لندن چلے گئے اور بیرسٹری کے امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے - وہ کیمبرج سے ڈگری لے چکے تھے - میں بیرسٹری پاس کر چکا تھا اور پی - ایچ - ڈی کے لیے جرمنی چلا آیا تھا - جب میں لندن آتا ان سے ملاقات ہوتی - اس عرصے میں میری ان سے اچھی خاصی ملاقات ہو گئی -

اس زمانے میں لندن میں مسلم لیگ قائم تھی اور آنریبل جسٹس امیر علی اس کے چیئرمین تھے - مارلے منٹو اصلاحات کے متعلق بہت کچھ شور ہنگامہ بھی ہوا تھا - مسلم لیگ جداگانہ انتخاب کے لیے جدوجہد کر رہی تھی - مگر میں اس کا مخالف تھا - جب سیّد علی امام لندن گئے تو انھوں نے وہاں مسلم لیگ کی آواز کے خلاف مخلوط انتخاب کا نعرہ بلند کیا - کیمبرج میں مسلمان طلبا نے انھیں بلایا اور مسلم لیگ کے مطالبے کے خلاف ان سے لیکچر دلوایا - اخباروں میں سیّد علی امام کے ساتھ ساتھ ہم چند طلباء کا نام بھی چھپا جس سے سیّد امیر علی ہم لوگوں سے اور خاص طور سے مجھ سے بہت برگشتہ ہوئے - چونکہ میں لندن مسلم لیگ کا جوائنٹ سیکرٹری تھا انھوں نے مجھ سے خود ہی استعفا طلب کیا جو میں نے اُن کے حضور میں پیش کر دیا -

نہرو بہت خاموش نوجوان تھے - ہندوستانیوں کے مختلف

جلسوں میں شرکت ضرور کرتے مگر خاموشی کے ساتھ - اب ان سے ملاقاتیں
بڑھیں اور ان مسائل پر فطرتاً گفتگو ہوتی ۔ میرے اور ان کے سیاسی
خیالات تقریباً ایک جیسے تھے - اس طرح ہم ایک دوسرے کے اور
قریب آگئے ۔

ہندوستانی طلبا عید اور ہولی وغیرہ کے جلسے منعقد کرتے ۔ ہم
سب اس میں شریک ہوتے ۔ اس زمانے میں سر ایڈورڈ گرے
انگلستان کے وزیر خارجہ تھے اور ان کی خارجہ پالیسی مسلمان ممالک
کے خلاف تھی ۔ چناں چہ انھوں نے جنوبی ایران میں اپنی فوجیں اتاریں ۔
ان کا روس کے ساتھ یہ سمجھوتہ تھا کہ وہ شمالی ایران پر قبضہ جمالے ۔ اس
پالیسی کے خلاف ہم ہندوستانی طلباء نے زبردست آواز اٹھائی
اور ایک بہت بڑا جلسہ کیا ۔ میجر سید حسن بلگرامی اس کے چیرمین
تھے ۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے جو اس وقت لیبر پارٹی کے چیرمین تھے
(اور بعد میں برطانیہ کے وزیر اعظم بنے) بھی اس میں شرکت کی تھی ۔
انھوں نے سر ایڈورڈ گرے کی پالیسی کے خلاف تقریر بھی کی تھی ۔ ہم نے
اس جلسے میں پروفیسر براؤن کا مرتب کیا ہوا ریزولیوشن پاس کیا ۔
ڈاکٹر سلیمان جو بعد میں سر سلیمان ہوئے ۔ دلی کے مسٹر رؤف علی اور
میں نے اس میں نمایاں حصہ لیا تھا ۔ لیکن پنڈت نہرو نے باوجود
انتہائی ہمدردی کے کھلے طور سے کوئی حصہ نہیں لیا تھا ۔ اس طرح
کے جلسے ہوتے رہتے تھے اور ان تمام کارروائیوں سے میرے اور
ان کے تعلقات بڑھتے گئے ۔

۱۹۱۲ء میں ہم لوگ ہندوستان واپس آگئے ۔ میں نے پٹنے میں
اور انھوں نے الہ آباد میں بیرسٹری شروع کی ۔ الہ آباد میں جب کوئی
سیاسی جلسہ ہوتا تو میں وہاں جاتا اور ان سے ملاقات رہتی ۔

میں علی گڑھ میں اسکول کی طالب علمی ہی کے زمانے سے کانگریسی
خیال کا تھا ۔ اس زمانے میں ایک مسلمان طالب علم کے لیے یہ ایک عجیب و
غریب بات تھی ۔ ۱۹۰۵ء میں بنارس کانگریس کے اجلاس کی
صدارت مسٹر گوکھلے نے کی تھی ۔ میں علی گڑھ سے بعض سینیر طلباء کے
ساتھ تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا تھا ۔ میرے انگریز ہیڈ ماسٹر
نے مجھے اس کے لیے سزا دی تھی ۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب یہ واقعہ میں نے
ولایت میں پنڈت نہرو سے بیان کیا تو انھیں یہ چھوٹا سا واقعہ
بہت پسند آیا اور شاید اس قصے نے بھی ان کو مجھ سے قریب کیا ۔

پھر ان سے ۱۹۱۵ء کی کانگریس میں جس کی صدارت لارڈ سنہا
نے کی تھی ، ملاقات ہوئی ۔ اس وقت میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر
ہو چکا تھا ۔ اس وقت بمبئی میں مسلم لیگ کا مشہور جلسہ ہوا تھا جس کی
صدارت پٹنے کے مولانا مظہرالحق نے کی تھی ۔ ان کے خطبے نے ملک میں
بڑی ہلچل مچا دی تھی ۔ انھوں نے بڑی ہمت اور بے باکی کے ساتھ آگے
بڑھنے کی تلقین کی تھی ۔ اس وقت مولانا مظہرالحق نے مسلمانوں کی جو
رہنمائی کی تھی مجھے یاد ہے کہ پنڈت نہرو نے اُسے بہت پسند کیا تھا
اور ان کو مسلمانوں سے اچھی امید بندھی تھی ۔

۱۹۱۶ء میں ہوم رول لیگ کی تحریک شروع ہوئی ۔ حالانکہ
یہ نہایت معتدل قسم کی تحریک تھی مگر اس زمانے میں یہ ایک باغی
جماعت کہی جاتی تھی ۔ پنڈت نہرو نے الہ آباد سے اور میں نے پٹنے
سے اس میں شرکت کی ۔

پھر تو مہاتما گاندھی کا دور آیا اور ہم دونوں بلا سوچے سمجھے
گاندھی جی کی لگائی ہوئی آگ میں کود پڑے ۔ الہ آباد میں عدم تعاون
کا ریزولیوشن پاس ہوا ۔ مولانا محمد علی و شوکت علی ، مولانا ابوالکلام
آزاد اور دیگر مسلم رہنماؤں نے ساری مسلم قوم کو مہاتما گاندھی کے
پیچھے کر دیا ۔ پنڈت نہرو نے اسے بھی بہت پسند کیا ۔ اس وقت تک
ہم دونوں میں بہت ارتباط پیدا ہو چکا تھا اور میں ان کے کام کرنے
کی غیر معمولی صلاحیتوں اور ان کی ذاتی خوبیوں کا نہ صرف مداح بن چکا
تھا بلکہ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ شخص بہت بڑا آدمی بننے والا ہے ۔
نان کوآپریشن کے زمانے میں تقریباً ہم لوگ برابر ساتھ رہتے ،
ساتھ سفر کرتے ، ملک کا دورہ کرتے ۔ ان کو بھی مجھ سے بڑی دلچسپی
پیدا ہو گئی تھی ۔ جب کبھی دورہ کرتے مجھے اطلاع دیتے کہ میں بھی
شریک ہوں ۔

جب کبھی الہ آباد آتا تو ان کے یہاں ٹھہرتا ۔ پنڈت موتی لال نہرو
آنجہانی اور ان کے خاندان کے دیگر لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ۔ ان کا
پورا خاندان انسانی خوبیوں سے پُر تھا اور ملک کے لیے ہر قربانی کے لیے

تیار تھا۔

خدمتِ خلق کا جذبہ میں نے ان میں بدرجہ اتم پایا۔ میں سفر میں ہمیشہ ایک نوکر ساتھ رکھتا تھا کیونکہ بستر وغیرہ باندھنے اور کھولنے میں مجھے سخت کوفت ہوتی تھی۔ جب ان کو معلوم ہوا تو مجھ سے کہا کہ آئندہ سے نوکر ساتھ نہ رکھا کرو۔ ہم کو دوسروں کی خدمت کرنی ہے۔ اس وقت نوکر سے اپنی خدمت لینے کا وقت کہاں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ریل میں میرا بستر بچھانا اور تہ کرنا شروع کیا۔ حالانکہ میں بڑی سختی سے انھیں روکتا تھا۔

جیل میں برابر ساتھ رہا۔ نینی (الہ آباد) اور احمدنگر جیل میں تو کافی دنوں تک ساتھ رہا۔ احمدنگر جیل میں سخت بیمار ہوا۔ کئی ماہ تک انھوں نے میری تیمارداری کی۔ خود باورچی خانے سے کھانا لاتے اور کھلاتے۔ چائے لاتے اور پلاتے۔

۱۹۲۹ء میں وہ لاہور کانگریس کے صدر ہوئے۔ اس کے بعد میں زیادہ تر آنند بھون میں ان کے ساتھ رہنے لگا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اپنی بیمار بیوی کی نہایت انہماک سے تیمارداری کرنے کے باوجود پبلک کاموں میں شریک ہوتے اور ان میں پوری پوری دلچسپی لیتے۔

جوانی میں وہ بہت تندمزاج تھے۔ کبھی کبھی کھانے کی پلیٹیں اٹھا کر پھینک دیتے۔ بہت جلد بگڑ جاتے۔ نینی جیل میں مجھ سے ایک دن میں کئی کئی بار جھگڑا ہوتا اور وہ غصہ دکھاتے لیکن چند منٹ بھی نہ گزرتے کہ خود میرے پاس آجاتے۔ زبان سے معافی تو نہ مانگتے لیکن ان کا طریقہ ایسا تھا کہ نہایت نرمی اور محبت کے ساتھ کچھ پوچھتے اور باتیں کرتے۔ ایک بار ان کے بہنوئی شری رنجیت پنڈت بھی وہاں قید تھے۔ انھوں نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ آپ سے اور ڈاکٹر محمود سے اتنا زیادہ جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ انھوں نے نہایت بگڑ کر جواب دیا کہ جھگڑا اسی سے ہوتا ہے جس سے محبت اور تعلقات ہوں۔ اور ایک دوسرے ساتھی کا نام لیا جو اس وقت وہاں تھے اور کہا کہ ان سے تو میرا جھگڑا نہیں ہوتا۔

ایک بار میرے گھر چھپرہ گئے۔ دو روز کے بعد لکھنؤ واپس جانے لگے جہاں ان کی اہلیہ بیمار تھیں۔ جب ریل چلنے لگی تو یک بیک زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لی اور گاڑی سے کود کر پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ایک ریلوے کا ملازم نہایت فحش گالیاں بکتا ہوا پلیٹ فارم سے گزر رہا تھا۔ انھوں نے فوراً جا کر اس کا گلا دبایا کہ پلیٹ فارم پر ایسی فحش گالیاں بکتے ہو۔ پلیٹ فارم پر موجود بہت سے لوگ ان کی اس عجیب وغریب حرکت پر ہنسے۔ اس چھوٹے سے واقعہ سے صرف ان کی تیز مزاجی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ وہ ہر شخص کو تہذیب اور شائستگی کا درس دینا چاہتے تھے۔ ان کی طبیعت کا یہ انداز آگے چل کر اور نمایاں ہوا۔

فرقہ وارانہ فسادات جہاں بھی ہوتے ہم دونوں پہنچتے۔ شر وفساد کو رفع کرتے اور میل جول قائم کرتے۔ لیکن ان موقعوں پر جس فرقے کا قصور ہوتا اور جس کی زیادتی سمجھتے نہایت بے خوفی سے ان کے منھ پر کہہ دیتے۔ فرقہ وارانہ فساد سے انھیں انتہائی تکلیف پہنچتی تھی اور ان کی روح چیخ اٹھتی تھی۔

ان سے میری آخری ملاقات ۱۰- مئی ۱۹۶۴ء کو ہوئی۔ یہ آخری ملاقات تقریباً ۴۵ منٹ کی تھی۔ اس ملاقات میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ ذاتی بھی اور قومی بھی۔ لیکن ان کی آنکھیں پُرنم تھیں اور میری بھی۔ جب باتیں کر کے ہم اٹھے تو وہ کمرے کے دروازے تک آئے۔ انھوں نے ہاتھ ملایا اور کسی قدر میرا ہاتھ دبایا۔ میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے پیچھے دیکھا نہیں۔ مگر جب لفٹ تک پہونچا تو دیکھا کہ وہ پیچھے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ میں لفٹ پر چڑھ گیا تھا۔ پاس آکر انھوں نے لفٹ میں جانے کے لیے قدم اٹھائے۔ غالباً ان کا منشا یہ تھا کہ وہ نیچے اتر کر موٹر تک مجھے پہونچائیں۔ میں نے انھیں سختی سے روکا اور واپس آگیا۔ اس بیماری کی حالت میں بھی ایک پرانے دوست کے ساتھ اس اخلاق اور محبت کا برتاؤ دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

۲۷ مئی کو وہ اچانک ہم سے بچھڑ گئے ۔ اس طرح پچپن سال کی ملاقات اور دوستی کا خاتمہ ہوا۔ یہ میرا ذاتی غم نہیں ہے بلکہ پورا ہندوستان کیا ساری دنیا ماتم کناں ہے۔ ہندوستان کے ہر مرد و زن کے دل میں ان کے لیے کتنا پیار تھا۔ اس کا مظاہرہ ہم دیکھ چکے ہیں۔

ابھی غم تازہ ہے۔ رفتہ رفتہ وہ ہمیں زیادہ یاد آئیں گے۔

میری حالت اس وقت ایسی نہیں ہے کہ ان کے بارے میں تفصیل سے کچھ لکھ سکوں۔ پچپن سال کے طویل عرصے میں اتنے واقعات اور اتنی باتیں ذہن میں گڈمڈ ہیں کہ کسی ترتیب سے انھیں پیش کرنا فی الحال ممکن نہیں ہے۔ ان کی موت کا سانحہ اتنا اندوہ ناک ہے کہ ذہن و دماغ قابو میں نہیں ہیں۔

ایڈیٹر آج کل کی فرمائش پر یہ چند سطریں قلمبند کرا رہا ہوں اور مجھے خود حیرت ہے کہ میں اتنا بھی کیونکر لکھوا سکا۔

خداوند تعالیٰ ہم میں ہمت اور توفیق دے کہ ہم ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل سکیں۔

جوش ملسیانی

قطعۂ تاریخ وفات

رہتی دنیا تک رہیں گے یاد اہلِ ہند کو — کارنامے جس قدر بھی ہیں جواہر لال کے

پوچھئے اہلِ سیاست ہی سے ان کی عظمتیں — دوسروں کو کیا خبر وہ کام کیا کیا کر گئے

مشرق و مغرب کا سر جھکتا تھا ان کے نام پر — اک عقیدت تھی زمانے بھر کو ان کے نام سے

یاد رکھیں گے ہمیشہ ان کو ابنائے وطن — مادرِ گیتی ہمیشہ روئے گی ان کے لئے

عیسوی سن میں لکھوا لے جوش یہ سالِ وفات — آہ رخصت محفلِ عالم سے نہرو بھی ہوئے

۱ ۹ ۶ ۴ ء

گوپی ناتھ امن

پنڈت جواہرلال نہرو

ارتقائے حیات

پنڈت جواہرلال نہرو جن کے ماتم کے آنسو ابھی تک خشک نہیں ہوئے ہیں ایک ایسے کشمیری برہمن خاندان میں پیدا ہوئے جو ملک کے سربرآوردہ خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو ایک آزاد خیال انسان تھے اور سروپ رانی نہرو ایک مذہبی خیال کی خاتون۔ گویا اپنے والد کی طرف سے تو جواہرلال کو آزاد خیالی کی تعلیم مل رہی تھی اور ماں مندروں میں اور سنتوں کے پاس لے جاتی تھی۔ پنڈت جواہرلال کا جنیو اسی طرح ہوا جیسے عام برہمن خاندانوں میں ہوتا ہے۔ سر گھٹایا گیا ننگے بدن پر پیلی دھوتی اوڑھی اور منتروں کا پاٹھ کیا۔ یہ ہے پنڈت جواہرلال نہرو کی ابتدائی زندگی کی تصویر۔

جواہرلال کو کسی اسکول میں تعلیم نہیں دی گئی بلکہ پنڈت موتی لال نہرو نے گھر پر معلّم رکھ کر پڑھایا۔ ان معلّموں میں ایک مسٹر ایف ٹی بروکس بھی تھے جو تھیوسافی کے ماہر اور مبلّغ تھے۔ ان کی تعلیم سے پنڈت جواہرلال میں مختلف مذہبوں کے لیے رواداری اور مشترک اعلیٰ اقدار کا احساس پیدا ہوا۔ سچ پوچھئے تو لیڈر جواہرلال نہرو کی تشکیل یہیں سے شروع ہو گئی۔

پنڈت موتی لال نہرو نے جو اپنے اس اکلوتے بیٹے کو اپنے سے بھی زیادہ بڑا وکیل دیکھنا چاہتے تھے بیرسٹری کی تعلیم کے لئے اسے ولایت بھیجا کیمبرج یونی ورسٹی سے بی۔ایس سی کرنے کے بعد جواہرلال نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ جو بچہ ماں کی گود میں مذہبی تعلیم پاتا تھا، جو مندروں اور مٹھوں میں گیا تھا، جس نے گھر پر تھیوسافی کی تعلیم پائی تھی اس نے انگلستان کی ایک اعلیٰ یونیورسٹی میں سائنس اور قانون کی تعلیم پائی۔ اس کے خیال میں اور وسعت ہوئی، دل و دماغ کی قوتوں کا وکاس ہوا اور ۱۹۱۲ء میں یہ نوجوان جواہرلال نہرو بیرسٹر ہو کر ولایت سے الہ آباد واپس آیا۔ انگلستان میں قیام کے دوران ہی پنڈت موتی لال سے خط و کتابت کے ذریعہ یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ سیاسی اعتبار سے لڑکا اپنے باپ سے زیادہ انتہا پسند ہے۔ ان کے ایک خط سے پنڈت موتی لال نہرو ناراض بھی ہو گئے تھے۔

پنڈت جواہرلال نہرو کی دیکھ ریکھ میں وکالت شروع کی مگر وہ وکالت کے لیے نہیں بنے تھے

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میلِ آں در طبعِ او پرداختند

جواہرلال نہرو کو رہنمائے عالم بننا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں مہاتما گاندھی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی بس یوں سمجھئے کہ یہیں ان کی سیاسی زندگی کی داغ بیل پڑی۔ اسی سال لکھنؤ میں کانگریس کا وہ اجلاس ہوا جس میں کانگریس اور مسلم لیگ کا سیاسی معاہدہ ہوا تھا۔ گاندھی جی اسی اجلاس کے سلسلہ میں اتر پردیش آئے ہوئے تھے جب اس زمانہ میں ممالک

متحدہ آگرہ و اودھ اور مخفف طور پر یو-پی کہتے تھے - ۱۹۱۷ء میں پنڈت موتی لال نہرو نے صوبائی کانفرنس کی صدارت کی - پنڈت جواہرلال نہرو کانگریس اور کانفرنس کے ان اجلاسوں میں شریک ہوئے جو اب کی کانگریس سے بہت مختلف تھے - برطانیہ کا قومی جھنڈا یونین جیک لکھنؤ کانگریس کے پنڈال پر لہرا رہا تھا

ببیں تفاوتِ رہ از کجا ست تا بکجا

لیکن پنڈت جواہرلال نہرو کی عملی شرکت ۱۹۱۹ء میں ہوئی جب وہ ایک ستیہ گرہی کی حیثیت سے گاندھی جی کے کیمپ میں شریک ہوئے - ۱۹۱۷ء میں اندرا کی پیدائش ہو چکی تھی - ابھی یہ بچی ۳ سال کی تھی کہ پنڈت جواہرلال نہرو نے وکالت کو خیرباد کہا اور گاندھی جی کا پیغام لے کر یو-پی کے دیہات میں پھرنے لگے - کہیں پیدل کہیں سائیکل پر کہیں یکہ پر اور کہیں تانگہ پر اکثر سفر میں بھیگ جاتے، کمبل لپیٹے کبھی کسی کسان کی جھونپڑی میں ساگ روٹی کھا رہے ہیں کہیں کسی غریب ہری جن کی جھگی میں بیٹھے اس کی داستانِ غم سن رہے ہیں - بیرسٹر جواہرلال اب کسانوں کا بیر جواہرلال بن چکا تھا - شہری زبان میں ویر جواہرلال کہہ لیجئے -

۱۹۱۹ء میں پنڈت موتی لال نہرو کانگریس کے صدر ہوئے - امرتسر کا یہ اجلاس بڑے معرکہ کا تھا کیونکہ اسی سال جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہو چکا تھا اور مہاتما گاندھی کی ستیاگرہ کی تحریک شروع ہو چکی تھی - ۲۰-۱۹۱۹ء کا زمانہ پنڈت جواہرلال نہرو کی لیڈری کا ابتدائی زمانہ تھا - ۱۹۲۱ء میں پنڈت جواہرلال نہرو کو پہلی بار سزا ہوئی - پھر تو ایک سلسلہ بندھ گیا جو ۱۹۴۵ء تک جاری رہا اور یہاں کیفیت یہ تھی کہ

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ ہر سزا کے بعد

انگریزی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ نہ تو پتھروں کی دیواریں قید خانہ بناتی ہیں اور نہ لوہے کی سلاخیں پنجرا بناتی ہیں جو دماغ بے گناہ اور سادہ ہیں وہ انھیں آشرم سمجھتے ہیں -

جیل جانے سے پہلے پنڈت جواہرلال نہرو صوبہ کانگریس کے سکریٹری تھے - جیل سے نکلنے کے بعد وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری بن گئے اور ۱۹۲۹ء میں صدر کانگریس ہونے تک اسی عہدہ پر رہے - پنڈت موتی لال نہرو نے اپنے بیٹے کو صدارت کا چارج دیتے ہوئے کہا

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

(جو کام باپ پورا نہ کر سکا وہ بیٹا پورا کرے گا) پنڈت موتی لال نہرو کی بات ٹھیک ہی نکلی - ۱۹۲۹ء میں پنڈت جواہرلال نہرو کی صدارت میں آزادئ کامل کا جو ریزولیوشن پاس ہوا تھا ایک خواب سا تھا جو اگست ۱۹۴۷ء میں شرمندۂ تعبیر ہوا - جس جواہرلال نہرو کی صدارت میں وہ ریزولیوشن پاس ہوا تھا وہی آزاد ہندوستان کا وزیر اعظم بھی ہوا اور اٹھارہ سال یعنی اپنی زندگی کے آخر تک اس عہدہ پر قائم رہا -

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جس جواہرلال نہرو کی پیٹھ پر ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کرنے پر لاٹھیوں کی مار پڑی تھی جس کی کمر میں رسی باندھ کر پاپیادہ نابھ کی حوالات سے عدالت میں لے جایا گیا جس نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ جیلوں میں گزارا تھا، وہ آزاد ہندوستان کا وزیر اعظم بن گیا - اگر وہ چاہتا تو ان لاٹھی چلانے والوں، ان جیل میں رکھنے والوں، ان بدسلوکی کرنے والوں کے خلاف کارروائی کر سکتا تھا لیکن

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا
دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

وزیر اعظم نہرو کا کام آسان نہ تھا جہاں ملک کی خوش قسمتی تھی، کہ وہ آزاد ہوا وہیں یہ بدقسمتی بھی کہ تقسیم ہو گیا - تقسیمِ وطن کے اس نتیجے سے پنڈت نہرو کو بہت دکھ ہوا کہ دونوں طرف مارکاٹ ہوئی اس ہنگامے کو ختم کرنے کے بعد اجڑے ہوئے لوگوں کو بسانا بھی تھا پنڈت جی نے یہ کام گاندھی جی کے مشورہ سے شروع کیا لیکن گاندھی جی کی شہادت کے بعد وہ اس نیک مشورہ سے بھی محروم ہو گئے لیکن وہ گاندھی جی کی سپرٹ کو اپنے اندر جذب کر چکے تھے - گاندھی جی پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ نہرو میرا سیاسی جانشین ہو گا - آنے والے واقعات

نے یہ ثابت کر دیا کہ گاندھی جی کی نظرِ انتخاب درست ہی تھی

ع دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح دونوں کا انتقال ہو گیا اب ہندوستان کے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو اور پاکستان کے نواب زادہ لیاقت علی خاں تھے۔ ان دونوں لیڈروں میں ایک معاہدہ ہوا کہ ایک دوسرے ملک کے خلاف پراپیگنڈا نہ ہو۔ اس معاہدے کے بعد جب پنڈت جی کراچی گئے تو ان کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا تھا۔

مدتوں کی محکومی کے بعد ملک کی مالی حالت خراب ہو چکی تھی۔ پنڈت جی نے اس زمانہ سے ہی منصوبہ بندی کا کام شروع کر دیا تھا جب ۳۹-۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے آٹھ صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم تھیں۔ ملک کے مکمل طور پر آزاد ہونے کے بعد اس طرف مزید توجہ کی گئی۔ ہندوستان میں اکثریت دیہاتی آبادی کی ہے اس لیے پنڈت جی نے گرام وکاس یعنی دیہات کی ترقی کی طرف خاص طور پر دھیان دیا۔ جن لوگوں نے وہ منظر دیکھا ہے انھیں یاد ہوگا کہ کس طرح پنڈت جواہر لال نہرو نے دلی کے علی پور نامی گاؤں میں خود اپنے ہاتھوں ٹوکریوں میں بھر کر مٹی ڈال کر سڑک کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ آج گرام وکاس کی تحریک ملک کی ایک عظیم تحریک بن گئی ہے۔ دیہات میں سڑکیں بن گئی ہیں۔ پنچایت گھر بنے، کمیونٹی سنٹر بنے، ریڈیو لگے، بجلی پہنچی اور چھوٹے موٹے دھندے شروع ہو گئے۔ یہ مشینی دور ہے۔ ملک کی صنعتی ترقی میں پنڈت جی کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ آزادی سے پہلے کے انقلابی باغی نہرو نے دکھا دیا کہ وہ ایک کہنہ نظام کو توڑنے کی ہی طاقت نہیں رکھتا بلکہ ایک نیا نظام قائم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ آج ہندوستان بہت سی چیزوں میں خود کفیل ہو چکا ہے۔ ایٹمی طاقت کی پیداوار بھی ہمارے دیش میں ہو رہی ہے مگر پنڈت نہرو نے برابر اس بات کی تاکید رکھی کہ یہ قوت تخریب کے لیے نہیں بلکہ تعمیر کے لیے استعمال ہو، بنی نوعِ انسان کو فنا کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس کی زندگی کو زیادہ خوشحال بنانے کے لیے اسے بروئے کار لایا جائے۔

بدقسمتی سے چین نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا۔ پنڈت جی کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے دل پر اس کا کتنا گہرا اثر پڑا اور اس نے ان کی صحت کو کتنا نقصان پہنچایا۔ بہرحال پنڈت جی کی قیادت میں ملک ایک آواز کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور حملہ آوروں کے حوصلے پست ہو گئے۔ یہ تھی ملکی رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک تصویر۔ لیکن ان کی ایک تصویر اور بھی ہے یعنی بین اقوامی لیڈر کی۔ انھوں نے اپنے ملک کو کسی ایک بلاک میں شامل نہیں کیا۔ اس سے نہ صرف ہندوستان کو فائدہ پہنچا بلکہ دنیا میں جنگ بھی نہیں ہوئی۔ اس طرح پنڈت جواہر لال نہرو کا احسان نہ صرف ہندوستان پر بلکہ دنیا پر ہے۔

آج کل کا اگست ۱۹۶۴ء کا شمارہ افسانہ نمبر ہوگا

جن میں کرشن چندر، علی عباس حسینی، بلونت سنگھ، کنہیالال کپور، سہیل عظیم آبادی، رضیہ سجاد ظہیر
ماجدہ تبسم، جیلانی بانو، اختر اورینوی، خواجہ احمد عباس، اپندر ناتھ اشک، رام لعل

اور دیگر بہترین افسانہ نگاروں کی بہترین تخلیقات کے شاملِ اشاعت ہونے کی توقع ہے

رنگین سرورق اور دلکش تصاویر کے علاوہ افسانہ نگاروں کی تصاویر بھی رسالے کی زینت ہوں گی۔ قیمت ایک روپیہ

سالانہ خریداروں کو یہ خاص نمبر چندے ہی سے ملے گا

ایجنٹ حضرات اپنی زائد ضروریات کے لئے بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی کو آگاہ کریں

عرش ملسیانی

دیدہ ور

یہ دنیا اپنی بدبختی و مقہوری پہ روتی ہے
یہ دنیا اپنی محرومی و مجبوری پہ روتی ہے
یہ دنیا آشتی و امن سے دوری پہ روتی ہے
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بہت ہوں گے رہے ہیں جن پہ الطافِ خداوندی
بہت ہوں گے سمجھتے تھے جو غمگینی کو خورسندی
بہت ہوں گے جنھیں آتا تھا آئینِ چمن بندی
بہت ہوں گے کرشمہ کار تھی جن کی ہنرمندی
کہاں ہوگا جواہر لال سا صاحب ہنر پیدا

وہ البیلا مجاہد اور ساتھی اس کے البیلے
نہ بل ماتھے پہ آیا لاکھ قید و بند بھی جھیلے
شجاعت کے ہزاروں کھیل اس ساونت نے کھیلے
سہے بے خوف ہو کر جور و استبداد کے ریلے
کسی میں تاب یہ کب ہے کرے ایسا جگر پیدا

ہوا وہ صاحبِ قلب و نظر اوجھل تو ہم روئے
غریبوں کو لگی اک چوٹ اربابِ حشم روئے
سیاست داں روئے صاحبِ سیف و قلم روئے
کلیسا سے اُٹھی اک چیخ اور دیر و حرم روئے
نہیں ہر روز ہوتا صاحبِ قلب و نظر پیدا

گُلِ تازہ تھا لیکن زندگی کاٹی ببولوں میں
جُھلایا اس نے اپنی قوم کو عزت کے جھولوں میں
بسایا نخلِ آزادی کی ہر ڈالی کو پھولوں میں
بھرا تھا اس نے اک جادو ارادوں میں اصولوں میں
کیا تھا اس کی ہر اک بات نے جذب و اثر پیدا

زمانے بھر کے رندوں کے لیے تھا اس کا مے خانہ
سنایا اس نے سب کو امن و آزادی کا افسانہ
اسے کرتا تھا سجدہ کوئی اپنا ہو کہ بیگانہ
وہ عالم دوست محبوبِ زماں تھا سب کا دیوانہ
کیا تھا اس نے دنیا کے دلوں میں اپنا گھر پیدا

وطن کو اس نے تعمیر و ترقی کے نشاں بخشے
مریضوں کو شفا دی بے مکانوں کو مکاں بخشے
کہیں بجلی کہیں صنعت کے گنجِ شائگاں بخشے
جو خاکِ شور تھی اس کو عجوبہ گلستاں بخشے
وطن کے ریگ زاروں میں کئے لعل و گہر پیدا

خیال اس کا ہمارے دیش کی روحِ رواں ہوگا
وطن کا پاسباں تھا پاسباں ہے پاسباں ہوگا
زمانے بھر میں اونچا اس کی عظمت کا نشاں ہوگا
وہ مردِ کامراں تھا ملک اس کا کامراں ہوگا
نہیں وہ قوم مرتی جس میں ہوں ایسے بشر پیدا

بڑا امام باڑہ

مچھی بھون میں کانسی کا بت

لکھنؤ

متعلقہ مضمون
صفحہ ۷، ۱۲
ملاحظہ کیجئے

حسین آباد امام با
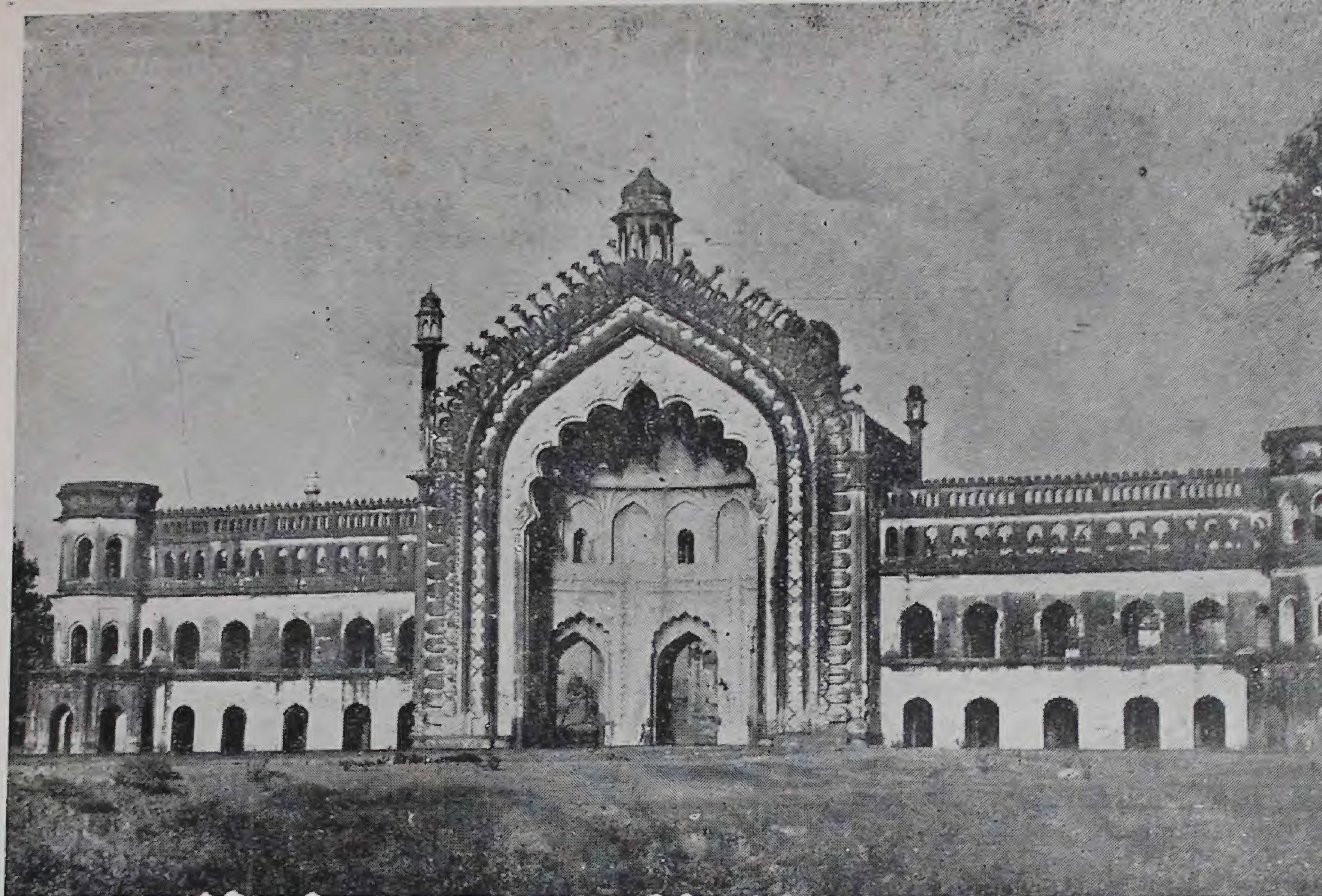
رومی دروازہ

گھنٹہ گھر حسین آباد

شاہ نجف

ریذیڈنسی

چھتر منزل

بارہ دری قیصر باغ

دریائے گومتی پر لوہے کا پل

ہارڈنگ برج

صالحہ عابد حسین
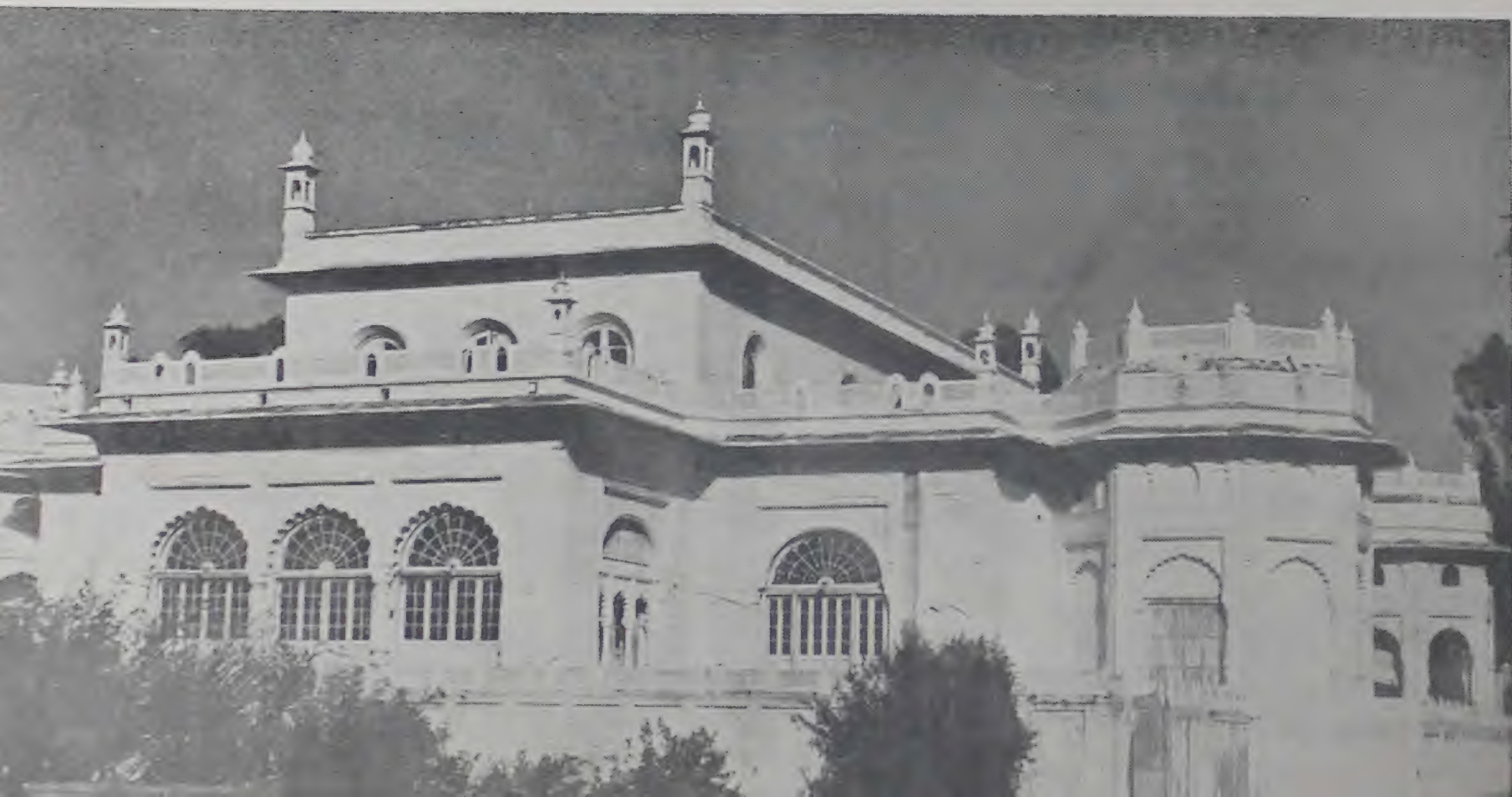
اجنتا کے گمنام فن کاروں کا امر پیام

اجنتا کی یاترا کو جائیے تو اپنے ہر طرف ایک پیغام گونجتا محسوس ہوتا ہے۔ تصویروں کی مسکراتی آنکھیں، مورتیوں کے بھرے بھرے لب، رنگوں کے امتزاج، جانوروں کی کلیلیں، دل کش نمونوں کا تنوع، بے جان پتھروں سے تراشے عظیم الشان ہال، منقش ستون سب اپنی زبان بے زبانی سے کچھ پیام دیتے ہیں۔ مہا تما گوتم بدھ اپنی شانت مسکراہٹ اور انگلیوں کے مخصوص اشاروں سے کچھ کہتے معلوم ہوتے ہیں — زندگی عبارت ہے کام سے — کام امر ہوتا ہے ان تھک محنت اور بے پایاں صبر کی بدولت۔ اور ہزاروں سال سے پتھر میں ڈھلی جانیں رنگوں میں گھلی زندگیاں انسان کو اس امید پر کچھ بتاتی سمجھاتی رہی ہیں کہ شاید اس میں اس عظیم پیام کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

مجھے الورا اجنتا دیکھنے کی تمنا مدت سے تھی۔ مگر اس دیرینہ آرزو کے بر آنے کی ساعت جنوری ۱۹۶۴ء میں مقرر ہوئی تھی کہ بہت سی رکاوٹوں، پریشانیوں اور خود اپنی بیماری کے باوجود وہاں جانے کا پروگرام بن ہی گیا۔ ۶۔ جنوری کی صبح کو میں اور عابد اورنگ آباد کے لیے روانہ ہوئے اور اگلے دن شام کو وہاں پہنچ گئے۔ اورنگ آباد کے کلکٹر رضوی صاحب اسٹیشن پر ہمارے خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔

دلی کی سخت سردی کے بعد اورنگ آباد کی ہلکی خوشگوار خنکی بڑی فرحت بخش تھی۔ جکڑے ہوئے اعضاء کھلے جا رہے تھے اور دل اندر سے عجیب سی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ ہمارا قیام جس ریسٹ ہاؤس میں تھا وہ اسٹیشن سے بہت نزدیک سڑک کے کنارے واقع ہے۔ میں رات بھر تانگوں اور بسوں کی آمد و رفت کی وجہ سے سو نہ سکی۔ سو غالباً ویسے بھی نہ سکتی کہ اجنتا دیکھنے کے اشتیاق میں نیند آنکھوں سے کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔

صبح سویرے رضوی صاحب کی بھیجی ہوئی کار ہمیں اجنتا لے جانے کے لیے آ گئی۔ جامعہ کے ایک پرانے کارکن ساتھی حسینی آرٹسٹ کہ جو اورنگ آباد کے رہنے والے ہیں اور جن کا آرٹ اور ذات سماجی سیوا کے لیے وقف ہے، ساتھ لیتے ہوئے ہم اجنتا کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ بھر ادبی شخصیتوں کی یا شعر و شاعری کی باتیں ہوتی رہیں۔ حسینی صاحب مولوی عبدالحق کے بڑے مداح اور معتقد اور ان ہی کی وجہ سے حالی کے پرستار ہیں۔ انھوں نے سنایا کہ ایک بار بمبئی میں تصویروں کے انعامی مقابلے میں جس کا عنوان محبت کا جادو (یا کچھ اسی قسم کا تھا) انھوں نے حالی کے اس شعر کو مصور کر کے پہلا انعام اور بڑی داد و تحسین حاصل کی تھی ؎

بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکم رانیاں ہیں

جوں جوں اجنتا قریب آ رہا تھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ عابد اور حسینی صاحب پہلے بھی کئی بار اجنتا آ چکے تھے اور اجنتا ان کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ میں نے اجنتا کی تصویریں بارہا دیکھی تھیں۔ دلی کے میوزیم میں مہا تما بدھ کی ایک عظیم الشان مورتی

بھی دیکھ چکی تھی۔ مگر اجنتا یا الورا کا کوئی واضح تصور میرے ذہن میں نہ تھا۔ غار کے نام سے کچھ کھوہ کا سا خیال آتا تھا۔ تارک الدنیا بودھ بھکشو ان غاروں میں عبادت و ریاضت کے لیے آتے ہوں گے اور فرصت کے وقت جوشِ عقیدت میں مہاتما بدھ کی مورتیاں اور تصویریں بناتے رہتے ہوں گے۔ اب یہ حسنِ اتفاق تھا کہ وہ اتنے اچھے فن کار بھی تھے کہ آج تک ان کا فن باقی ہے اور داد و تحسین پا رہا ہے۔ کچھ اس قسم کے دھندلے سے خیالات میرے ذہن میں تھے۔ ویسے تو اجنتا الورا پر لکھے افسانے اور نظمیں بہت سی پڑھی تھیں مگر جیسا کہ قاعدہ ہے کہ تاریخی مقامات دیکھنے سے پہلے گائڈ بکس خرید کر معلومات حاصل کی جاتی ہیں، وہ میں نے نہیں کیا۔ میں دوسروں کی رائے کے اثر سے آزاد رہ کر خود اپنی آنکھوں سے اجنتا دیکھنا اور ذاتی رائے قائم کرنا چاہتی تھی۔ مگر دل میں ایک چھپا ہوا خوف بھی تھا کہ جن چیزوں کی حد سے زیادہ تعریف سنی ہو ان کو دیکھنے کے بعد اکثر مایوسی ہوتی ہے۔ کہیں میرے ذہن کو بھی اجنتا دیکھ کر مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اجنتا نام کے گاؤں سے آگے نکل کر پہلے ڈاک بنگلے آئے جو ایک خوش نما پہاڑی پر واقع ہے اور جہاں سے دور تک وادی کا حسین منظر نظر آتا ہے۔ وہاں دوپہر کے کھانے کا آرڈر دے کر آگے بڑھے۔ بارہ بجنے والے تھے۔ ایک سے دو بجے تک گائڈ کھانا کھاتے ہیں اور بجلی (جو وہیں ایک جنریٹر سے پیدا کی جاتی ہے) بند رہتی ہے۔ لمبی لمبی ڈوریوں کے سرے پر کئی کئی ہزار کینڈل پاور کے بلب لگے ہوتے ہیں جن کو گائیڈ ہاتھ میں لے کر تصویروں اور مورتیوں پر روشنی ڈال کر دکھاتے ہیں۔

وادی اور زیادہ حسین ہوتی جا رہی تھی۔ نیچی نیچی منگئین پتھر کی چٹانیں جن کو گھاس اور جھاڑیوں نے ڈھک رکھا تھا بڑی خوش نما تھیں۔ موسم اس وقت خشک تھا۔ صرف وادی کے بیچ میں ایک پہاڑی ندی بہہ رہی تھی جو عین اجنتا کے نیچے کی وادی سے گزرتی ہے برسات کے موسم میں قدرتی چشمے، ندیاں اور جھرنے یہاں کے حسن میں اور چار چاند لگا دیتے ہیں۔ موٹر نشیب و فراز طے کرتی تیزی سے دوڑ رہی تھی اور ہر موڑ پر میں چونک اٹھتی۔ ہر پہاڑی پر دھوکا ہوتا "پندارم تو ی؟"

اچانک ایک موڑ کے بعد اجنتا کے غاروں کے در و بام و ستون نظر آنے لگے۔ نیم دائرے کی صورت میں جس کی گولائی نعل (U) کی طرح کی ہے ایک بلند سنگلاخ چٹان پر غاروں کے باہری حصے نظر آ رہے تھے۔ تخیل نے جتنی شکلیں اب تک ان غاروں کی تعمیر کی تھیں اصل ان سب سے کتنی مختلف تھی!

اس یادگارِ زمانہ پہاڑی کے دامن میں پہنچی تو دیکھا کہ منزلِ شوق تک پہنچنے کے لیے ابھی کئی سو سیڑھیوں کا پل صراط چڑھنا ہے۔ دمہ کی بیماری سے ابھی پوری طرح چھٹکارا نہیں ہوا تھا۔ چار دن پہلے تک اپنے گھر کی اوپر کی منزل تک جانے کی اجازت نہ تھی۔ اور اب؟ کئی آوازیں پڑیں۔ "ڈولی چاہیئے، ڈولی؟" عابد صاحب کا اصرار تھا کہ ڈولی لے لو مگر میں نے منظور نہیں کیا۔ اگر صحت اس قدر جواب دے چکی ہے تو بہتر ہے کہ سیر و سیاحت کا خیال ہی چھوڑ دیا جائے۔ بہرحال دم لیتے ہوئے کسی طرح اوپر تک پہنچے اور پھر اس کے بعد تین گھنٹے تک غاروں میں گھومتے رہے اور ایک غار سے دوسرے غار میں جانے کے لیے سینکڑوں سیڑھیاں چڑھنی اترنی پڑیں۔ مگر عالمِ شوق میں اس طرف دھیان ہی نہ گیا کہ ٹانگوں اور دل کا کیا حال ہے۔ اس کا بھگتان تو بعد میں بھگتنا پڑا۔

حسینی صاحب کے ایک دوست شمیم صاحب نے ایک صاحب کے نام تعارفی پرچہ لکھ دیا تھا جس کی بدولت ایک بہت اچھے گائڈ ہمیں مل گیے۔ یہ بڑے تیز، صاحبِ ذوق اور اجنتا کی تاریخ سے واقف نکلے۔ تھوڑے سے وقت میں انھوں نے اجنتا کی سب سے اچھی اور اہم چیزیں ہمیں دکھا ڈالیں۔ کھانے کے وقفے میں جب روشنی نہ تھی تو انھوں نے ان غاروں کی سیر کرائی جہاں نصف النہار سورج کی روشنی خوب پہنچ رہی تھی۔

اجنتا کے غاروں، تصویروں اور مورتیوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کی فنی خوبیوں اور مذہبی و روایاتی خصوصیات کو بیان کرنے کا نہ میرا منصب ہے اور نہ میری اہلیت۔ یہ کون نہیں جانتا کہ اجنتا دو ہزار سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ تقریباً سات سو

برس تک تعمیر ہوتا اور بنتا بگڑتا رہا ہے - اور یہ شاہکار نتیجہ ہیں ان نفس کش مذہبی ارادتمندوں کی اُس ان تھک محنت کا جو اپنے بھگوان کی پوجا کے لیے یہ عظیم الشان ہال تعمیر کرنے اور اپنے دل کی ساری عقیدت پتھروں میں ڈھالنے اور رنگوں میں سمونے کے فن کے ماہر تھے - پھر خدا جانے کیسے زمانے کی گردش نے ان غاروں کو مٹی کے تودوں اور پتھروں سے اس طرح ڈھک دیا کہ صدیوں کسی کو ان کا پتہ ہی نہ چلا - یہاں تک کہ ایک دن ---- سو سال سے کچھ زیادہ ہوئے ---- ایک انگریز میجر شیر کا شکار کھیلتا اتفاق سے ادھر آیا - اس طرف وہ تھا، ادھر پہاڑ تھا، بیچ وادی میں ندی بہہ رہی تھی جہاں شیر بھاگ کر غائب ہو گیا تھا - وہ دوسری طرف کے پہاڑی کے حسن سے کچھ ایسا مسحور ہوا کہ زخمی شیر کو بھول کر اسی میں محو ہو گیا - اور یکایک اس کی نظر پہاڑ کے وسط میں ایک بلند محراب کے اوپری حصے پر پڑی اور قدرت کی متاع میں اسے انسانی فن کاری کا ہاتھ نظر آیا - اور وہ اسی کھوج میں لگ گیا اور پھر بدیسی انگریزی حکومت اور حیدر آباد ریاست کی متفقہ کوششوں کی بدولت اجنتا دریافت ہوا تو دنیا ہندی تہذیب و تمدن اور فن و کمال کی دو ہزار برس پہلے کی یہ ترقی دیکھ کر دنگ رہ گئی - یہ سب باتیں کم و بیش اجنتا پر لکھی گائڈ بکس میں مل جاتی ہیں - ہاں میں یہاں صرف وہ تاثرات بیان کروں گی جو اجنتا کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوئے -

یہ تیس غار جو ایک ہی پہاڑی پر سلسلے وار ایک کے بعد ایک نیم دائرے کی صورت میں بنے ہیں یہ بتلاتے ہیں کہ یہ کام ایک نسل کے بعد دوسری نسل برابر کرتی رہی ہو گی - ان کے مذہبی عقیدوں میں فرق ہوتا رہا ہو مگر فن کاری کے کمال اور محنت کشی کی بے مثال خصوصیت صدیوں تک یکساں رہی ہے -

ابتدائی زمانے کے غار وہار کہلاتے ہیں - ان میں مہاتما بدھ کی مورتی نہیں ہوتی - یہ اس زمانے کے بنائے ہوئے ہیں جب تک بودھ مت میں مورتی پوجا شروع نہیں ہوئی تھی - ان عظیم الشان ہالوں کی بناوٹ اور طرز تعمیر ایسا ہے کہ سنا ہے، دنیا بھر کے ماہرین تعمیرات انھیں آ کر دیکھتے اور حیران رہ جاتے ہیں جب کہ سائنس کی حیرت انگیز ایجادات انسان کی مدد کے لیے موجود نہ تھیں بلکہ جدید قسم کے آلات تک نہ تھے صرف معمولی چھینی، کدال اور بسولے کی مدد سے ان فن کاروں نے سنگ تراشی اور تعمیر کے کیسے کیسے چمتکار اپنے باکمال ہاتھوں سے دکھائے ہیں - ان سینکڑوں فٹ مربع وسیع ہالوں کی ہموار چھتیں، ان میں ان گنت منقش ستون، بڑی بڑی شاندار محرابیں، لمبی لمبی گیلریاں اور آواز پھیلنے کا ایسا سسٹم کہ ایک وقت میں ہزار سے زیادہ آدمی آسانی سے وعظ کا ایک ایک لفظ سن سکیں - آج سائنس کی دنیا کے ماہرین تعمیر بھی حیران ہوتے ہیں - انسان کے ذہن کے اس عروج اور ہاتھوں کی اس قوت پر جس نے اجنتا کے یہ عظیم الشان ہال تعمیر کیے، لاتعداد ستون تراشے جن میں ہر ایک پر جدا جدا طرز کے نقش ہیں - در و ایوان سجائے، محرابوں کا نوک پلک درست کیا - قدرت کی بنائی سنگلاخ چٹانوں کے سینے کی گہرائیوں میں اتر کر کیسے کیسے معجزے انسانی دماغ اور ہاتھ نے دکھائے ہیں -

دیکھنے والا سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا آج کا انسان یہ دعوے کر سکتا ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ مہذب اور روشن خیال ہے - اس کی تہذیب و ترقی جس نے دنیا کو امن و شانتی کے انمول جواہر سے محروم کر کے انسان کے دل کا چین اور دماغ کا سکون، عقیدہ اور ایمان چھین لیا ہے - آج کا انسان آئے اور دیکھے امن کے پجاریوں، شانتی کے پرستاروں کے یہ کارنامے، جنھوں نے نور ایمان کی روشنی میں عقیدت کی شکتی سے، امن و محبت کا یہ امر سندیسہ ہزاروں برس پہلے سنگ و رنگ کی زبان سے دنیا کو دیا تھا اور آج تک دے رہے ہیں - وہ پیغام جو اس وقت بھی امر تھا، آج بھی لافانی ہے -

اگر اجنتا میں اور کچھ نہ ہوتا صرف یہ عظیم الشان ہال ہی ہوتے (جو نیچے سے نہیں بلند پہاڑوں پر اوپر سے، چھت سے بننے یعنی تراشے شروع کیے جاتے تھے) وہ بھی اجنتا کو دنیا میں بے مثال بنانے کے لیے کافی تھے - مگر نہیں یہاں صرف فن تعمیر و سنگ تراشی ہی نہیں صنم تراشی اور مصوری کے بھی وہ حسین نمونے موجود ہیں جن کے حسن کمال کو آج دو ہزار سال بعد بھی دنیا خراج عقیدت پیش کر رہی ہے -

انسان کا دل مذہبی عقیدت کا مندر اور دماغ حسن کاری اور حسن شناسی کا مسکن ہے - اس کی گواہی اجنتا کا ایک ایک پتھر دیتا

ہے۔ ہزاروں برس پہلے کا یہ سیدھا سادا انسان اگرچہ ترک، تیاگ اور نفس کشی کی کٹھن زندگی گزارتا تھا وہ خود رہنے کے لیے انہیں غاروں کے پہلوؤں میں چھوٹی چھوٹی تنگ، سپاٹ کوٹھڑیاں تراش لیتا تھا، جن پر کال کوٹھڑی کا دھوکا ہوتا ہے۔ مادی ضرورتوں اور نفس کی خواہشوں کو پیروں تلے روندکر روحانی مسرت حاصل کرتا اور ابدی زندگی کی راحتوں کی امید میں زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر اس کا دل حسن کامل کا مسکن اور دماغ فن کاری کی صلاحیتوں کا خزانہ تھا اور اپنی ان قدرتی صلاحیتوں کو جس جس انداز میں اس نے اجنتا کے پتھروں اور دیواروں کو زندگی بخش کر امر کیا اس کی بدولت آج بھی ان عظیم فن کاروں کے گم نام نام زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

فن کار کتنا ہی ماہر ہو اس کے فن میں یہ زندگی، یہ حسن اور کشش پیدا ہو نہیں سکتی جب تک وہ زندگی کے سارے رموز سے واقف نہ ہو اور ساتھ ہی اس میں وہ سچا گہرا اٹل عقیدہ نہ ہو، وہ بے پایاں عقیدت اور محبت دل میں جلوہ گر نہ ہو، جو پتھروں میں جان ڈالتی، رنگوں کو زندگی بخشتی اور نمونوں کو امر بناتی ہے۔ حسنِ حقیقی سے آگہی، حسنِ مجازی کا گہرا مشاہدہ، روحانی دنیا کا عشق اور مجازی دنیا کی ہر چیز سے گہری واقفیت یہ اجنتا کے ان ہزاروں گم نام فن کاروں کی بنیادی خوبیاں تھیں جنھوں نے صدیوں فن اور اس کے ذریعے انسانیت کی خدمت کا مقدس کام انجام دیا۔

مقصدی آرٹ کے بڑے حسین نمونے جن میں فن اور مقصد کو سمو کر زندہ جاوید بنا دیا گیا ہے لندن اور پیرس کی آرٹ گیلریوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان تصویروں میں زمانہ وسطیٰ کے یورپین مصوروں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم اور ان سے متعلق واقعات کی ان کی سینکڑوں تصویروں میں اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔ عقیدت و بھگتی کا یہی کرشمہ اس سے بھی ہزار برس پہلے اجنتا میں دکھایا جا چکا تھا۔ فنی لحاظ سے بھی اجنتا کے شاہکار کسی طرح ان شاہکاروں سے کم درجہ کے نہیں ہوں گے۔

مصوروں اور سنگ تراشوں کے علاوہ، میرا خیال ہے کہ عام طور پر اجنتا لوگوں کو زیادہ پسند نہیں آتا ہوگا۔ یا پھر مذہبی عقیدت مندوں کو جو دوسرے نقطۂ نظر سے ایک مندر کی طرح اس کی زیارت کرتے ہیں۔ اجنتا کے حسن کو سمجھنے کے لیے اجنتا کے یاتری میں اگر مشاہدے کی گہرائی، نظر کی باریکی، حسنِ ذوق، ذوقِ حسن اور احترام فن کا جذبہ (جو خود اجنتا کے فن کاروں کو قدرت نے بڑی فیاضی سے عطا کیا تھا) کچھ نہ کچھ موجود نہ ہو اور اس ایمان و عقیدت کی شمع کی ہلکی سی روشنی دل میں جلوہ گر نہ ہو جو ان فن کاروں کی روح میں روشن تھی تو وہ اجنتا کو سمجھنے سے قاصر اور اس کے فن کا احترام کرنے کی اہلیت سے معذور ہوگا۔ وہ شاید کچھ اس طرح سوچے کہ اجنتا میں کچھ دیمک کھائے ہوئے، کچھ دھندلی ہوئی اور مٹتی تصویروں اور بہت سے خوبصورت ڈیزائنوں کے سوا اور ہے کیا؟ گائیڈ جس انداز سے لوگوں کو اجنتا کی تصویروں کی خصوصیات بتاتے ہیں اس سے میرے خیال کی تصدیق ہو رہی تھی کہ دیکھنے والوں کی ذہنیت کس قسم کی ہے۔

"اس ڈانسر کے بالوں کا اسٹائل دیکھئے۔ آج کی فیشن پرست لیڈیاں اس کی نقل کرتی ہیں۔"

"یہ پرس دیکھا آپ نے، بالکل موڈرن ڈیزائن۔"

"یہ مفلر — یہ اسکارف — یہ باڈی   واہ جدید ترین فیشن کی ہر چیز اس زمانے میں رائج ہو چکی تھی۔"

"دیکھا آپ نے کیسے بیوٹی فل ڈیزائن ہیں۔ آج ساری دنیا میں اجنتا کے ان سندر ڈیزائنوں کی نقل کی جاتی ہے۔ صاحب یورپ اور امریکہ والے ان ڈیزائنوں پر مرتے ہیں۔"

یا پھر کچھ لوگ ہندو مت اور بودھ میتھالوجی کے واقعات دہرا رہے تھے۔ ان میں مافوق الفطرت کہانیوں پر زیادہ توجہ تھی۔ فن کاروں کی ان تھک محنت اور جانکاری اور فن کارانہ حسن کے احساس، مشاہدے کی گہرائی اور زندگی کے راز سے آگاہی، ان باتوں کو سراہنے کی ضرورت شاید اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ سننے والوں کو بھی اس سے شاذ ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ بہت سے مرد اور عورتیں اس انداز سے اجنتا دیکھ رہے تھے اور ان کے ناسمجھ بچے بور ہو کر ماں باپ کو پریشان کر رہے تھے۔

لیکن ہمارا گائڈ صاحب ذوق اور اجنتا سے خوب واقف تھا۔

اُسے وجد کی شاہکار نظم اجنتا کے بہت سے اشعار یاد تھے جن کو وہ بڑے موقع موقع سے پڑھتا تھا۔ دو تین غاروں میں اونچی اونچی مچانوں پر کئی مصور بیٹھے اجنتا کی تصویروں کی نقل کر رہے تھے یا ٹریسنگ پیپر سے انھیں اتار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ سرکاری طور پر اس کام پر متعین کیے گئے ہیں تاکہ اجنتا کی خاص خاص تصویروں کو نقل کر کے انھیں محفوظ کر لیا جائے۔

اجنتا کے غاروں میں سے آخر کے دو تین غار نامکمل بلکہ کہنا چاہیئے بالکل ابتدائی منزل میں ہیں۔ ان ادھورے غاروں کو دیکھ کر کچھ تھوڑا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان سنگین چٹانوں کو کاٹنا کتنا مہیب، کتنا خطرناک، کتنا کٹھن کام تھا۔ ایک غار میں پتھر پر مورتی بنانے سے پہلے کسی تیز نوک دار آلے سے صرف آؤٹ لائنز کھینچی ہوتی تھیں۔ انھیں مجیانک پتھروں کو کاٹ کر اور تراش کر ان عظیم فن کاروں نے یہ شاندار ہال، یہ حسین مورتیاں تراشی تھیں ؟ یہ دیکھ کر انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ واقعی حسن تو فن کار کی آنکھ اور ہاتھ میں ہوتا ہے تبھی تو وہ ان بدصورت پتھروں سے حسن و خوبی کے ایسے مجسمے تراش سکتا ہے۔

اجنتا میں یوں تو سینکڑوں مورتیاں، ہزاروں تصویریں ہیں اور اگر یہ کہوں کہ ہر ایک اپنے انداز میں لاجواب ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا وہ جانور ہوں یا پیڑ پودے، پھل اور ترکاریاں ہوں یا محض خوبصورت ڈیزائن ہر نقش اپنا ایک مخصوص حسن رکھتا ہے۔ ان سب کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے تو بہت فرصت و اطمینان کی ضرورت ہے۔ لیکن ان ہزاروں میں سے چند تو میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہیں۔

غار نمبر ا کے وسیع ہال کے آخری سرے پر ایک چھوٹے سے برآمدے سے گزرنے کے بعد ایک کوٹھڑی میں مہاتما بدھ کی عظیم الشان مورتی بنی ہے۔ وہ حسب دستور دھرم چکر پر اپنی مخصوص نشست میں بیٹھے ہیں۔ یہ مورتی فن بت تراشی کا بڑا شاہکار ہے جسم کا تناسب، آنکھوں میں پریم کی جوت، گھنی پلکوں کا خم اور رخساروں پر ان کا پڑتا ہوا سایہ، ہونٹوں کی مدھر مسکراہٹ میں شانتی کا لافانی پیام، انگلیوں کے مخصوص اشارے سے امن و سلامتی کا درس دیتے ہوئے!! پوری مورتی پر عظمت و سکون قلب کی کچھ ایسی کیفیت ہے کہ میں مسحور ہو کر اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ ذرا دیر کے لیے ذہن اس مادی و سائنسی دنیا سے دور چلا گیا۔ ان نیم وا آنکھوں کی اور تاکتے ہوئے ایسا لگا کہ بدھ کی عظیم شخصیت آج بھی دنیا کو امن و شانتی کا وہی سندیسہ سنا رہی ہے۔ کوٹھڑی کے جس کونے سے دیکھیے مورتی کی آنکھیں آپ کو اپنی ہی طرف دیکھتی معلوم ہوتی ہیں اور ہونٹوں کی مسکراہٹ سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف آپ کے لیے ہے۔

سترہ نمبر غار میں مہاتما بدھ کی اپنے گھر واپسی دکھائی گئی ہے جب وہ اپنے ہی گھر کے دروازے پر کاسۂ گدائی لے کر آئے ہیں۔ ان کے قدموں کے پاس ان کی بیوی اور ننھا بچہ کھڑے ان کی سمت تک رہے ہیں۔ بدھ کی بلند و بالا پُرعظمت مورتی ان کو عام انسانوں کی صف سے بلند کر رہی ہے۔ فراق کی ماری بیوی کی آنکھوں میں مجروح محبت، دکھ اور رعب کا ملا جلا امتزاج ہے اور بچہ حیران نظروں سے انھیں دیکھ رہا ہے۔

آخری غار میں مہاتما بدھ کی وفات کا منظر ہال کی پوری دیوار پر بڑی خوبی و کمال کے ساتھ تراشا گیا ہے۔ بدھ کی چوبیس فٹ لمبی لیٹی ہوئی مورتی کے چہرے پر جو سکون و طمانیت ہے وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اُسے نروان مل گیا۔ نیچے بیٹھے لوگوں کے چہرے پر دکھ، غم، فراق اور بے بسی کے گہرے جذبات ڈھالے گئے ہیں کہ جیسے سچ مچ کے انسان کسی عظیم شخصیت کا سوگ مناتے نظر آ رہے ہیں۔ اور مورتی کے اوپر سورگ میں بدھ کے آنے کی خوشی میں وہاں کے باسیوں کے چہروں پر مسرت و اشتیاق کے رنگ نکھرے ہوئے ہیں۔ ایک ہی جگہ ایک ہی سین میں کئی کئی مناظر اور واقعے بیان کرنا اور ان کی خوبی سے عکاسی اجنتا کے فن کاروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔

سنگ تراشی کے اس سے کہیں بڑے کمالات ایلورا خصوصاً کیلاش (غار نمبر ۱۶) میں نظر آتے ہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہاں بھی اگرچہ محنت، جاں کاہی، فن کارانہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں مگر عقیدت و بھگتی میں وہ شدت و گہرائی نہیں جو اجنتا کی خصوصیت ہے اور نہ حقیقی زندگی سے آئی گہری واقفیت نظر آتی ہے جو اجنتا کے

فن کاروں کا حصّہ تھی۔ یہاں حسن کاری کا شوق اور نمائش کا جذبہ غالب نظر آتا ہے اور بہت سے قصّوں، بہت سی مورتیوں اور بہت سی روایات کو اکٹھا کرنے کے شوق میں نفاستِ طبع ہو گئی ہے

اور اجنتا کی تصویریں! کیسے ان پر اظہارِ خیال کروں! نہ مصوّر نہ شاعر نہ نقّاد، کیسے ان حسین شاہکاروں کو خراجِ تحسین پیش کروں؟ ہاں میرا سر ان باکمال مصوّروں کے سامنے جھک گیا جنھوں نے بے جان تصویروں کو یہ زندگی، یہ حسن اور یہ پائیداری عطا کی۔ رنگ ایسے شوخ، اتنے سبز، ایسے تر و تازہ کہ چغلی کھاتے ہیں کہ یہ فن کاروں کے دل کے خون کی بخشی ہوئی رنگینی و تازگی ہے جو کبھی نہیں مٹتی۔ جسم ایسے سڈول، ان کے خطوط ایسے دلآویز کہ زہرہ و وینس رشک سے خار کھائیں۔ آنکھیں ایسی نشیلی کہ زاہدِ پاکباز بھی بے پیئے جھومنے پر مجبور ہو جائے۔ ہاتھوں اور پاؤں کی جنبشیں ایسی مکمّل کہ بس اب حرکت میں آئی کہ آئی۔ محبّت، نفرت، غصّہ، بے بسی، مجبوری، خواہش طلب، ہوس، بے نیازی، اشتیاق، ہر جذبے کا اتار چڑھاؤ اپنی اپنی جگہ اتنا بھرپور کہ جیسے تصویر اب منھ سے بول پڑے گی۔ عشق و محبّت کے مناظر میں عریانی کے باوجود وہ تقدّس کہ بوالہوس کی آنکھیں بھی جھک جائیں اور وہ پکار اٹھے ؏

تقدّس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عُریانی

راجا پرجا، گرو چیلے، میاں بیوی، عاشق معشوق، رانی باندی، امیر غریب، رند و زاہد، ناستک و خدا پرست، انسان اور جانور، ہر ایک کا ایک دوسرے کی زندگی سے تعلق، ان کی آپس کی کشمکش، روحانیت اور مادّیت کا تضاد، زندگی کا کون سا پہلو ہے جو ان باریک بین فن کاروں کی نظروں سے چھپا ہوا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ تارک الدنیا ہوتے ہوئے بھی ان کے دل میں زندگی سے اتنا پیار اور ایسی گہری واقفیت تھی کہ ٹھیٹ دنیا داروں کو بھی اتنی نہیں ہو سکتی۔ مشاہدہ کی گہرائی کا یہ عالم کہ ہر جذبہ، ہر خیال، ہر حرکت تصویر میں یوں سمو دی جاتی ہے جیسے قدرت سموتی ہے۔ ایک دیوار پر مہا تما بدھ کی سو تصویریں مختلف آسنوں میں اس کمال سے دکھائی گئی ہیں کہ ہر ایک میں بیٹھنے کا انداز جداگانہ ہے۔ یہ بھرپور مشاہدہ صرف انسانوں ہی تک محدود نہیں جانوروں کی تصویروں میں بھی یہی زندگی، یہی جذباتی اتار چڑھاؤ دکھایا گیا ہے۔ پھولوں، پھلوں، پودوں، درختوں ندیوں، جنگلوں، محلوں، جھونپڑوں ہر ایک کو اسی خوبی سے دکھایا گیا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ اس دور کی زندگی، رہن سہن اور تہذیب کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

پدما پانی کی تصویر اجنتا کی بہترین تصویروں میں سے ہے۔ اس کو دائیں، بائیں، سامنے کسی طرف سے دیکھیے آنکھوں کی پتلیاں ہی نہیں جسم کا رُخ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی طرف مڑ گیا۔ اس کا جسم اتنا حسین و متناسب اور چہرے پر انسانی اور ملکوتی حُسن کا ایسا امتزاج ہے کہ دیکھتے رہیئے مگر سیری نہیں ہوتی۔

ایک اور بے انتہا اچھی تصویر ایک عورت کی ہے جسے اجنتا کی شہزادی کا لقب بجا طور پر دیا گیا ہے۔ حسن و رعنائی میں اس کا جواب شاید مصوّری کی تاریخ میں نہ مل سکے۔

مرتی ہوئی راجکماری ایک اور حسین و جذباتی مرقع بخشتی ہے۔ مہا تما بدھ کا سوتیلا بھائی نندا راج پاٹ چھوڑ کر بھکشو ہونا چاہتا ہے نندا کی جوان و حسین بیوی اس کو روکنے کے لیے عیش و عشرت کے سارے سامان فراہم کرتی ہے۔ اپنی جوانی و حسن کے سارے ہتھیار آزماتی ہے کہ کسی طرح پتی کی جدائی کے روح فرسا صدمہ سے بچ سکے مگر حق کی تلاش کی لگن اُسے ہر لالچ، ہر محبّت اور ہر لگاؤ سے بے نیاز کر چکی ہے اور وہ اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس کی حرماں نصیب عاشق زار بیوی یہ خبر سنتی ہے تو بے ہوش ہو کر گر جاتی ہے۔ وہ موت کو لبیک کہہ رہی ہے۔ اس سارے واقعے کو اس کمال کے ساتھ مصوّر کیا گیا ہے کہ انسان عش عش کرتا رہ جاتا ہے۔

مگر اجنتا کی عظمت کا راز کیا ہے؟ سوچتی ہوں تو دل کہتا ہے اس کی بڑائی پنہاں ہے ان لاکھوں انسانوں کے بے پایاں خلوص ان تھک محنت، اتھاہ صبر کے اندر جس کا خزانہ ان کے دل تھے۔ اس کی بدولت ان کے فن پارے امر ہوئے۔ دس بیس، سو پچاس برس نہیں سات سو برس تک ہزاروں آدمی نسلاً بعد نسلاً یوں اس کام میں جٹے رہے جیسے یہی حاصلِ حیات ہے۔ اور اپنے ماتھے کے پسینے

اور جگر کے لہو سے اس میں آب و رنگ بھرتے رہے۔ یہ انفرادی کام نہیں ٹیم ورک ہے۔ یہ نام و شہرت کے طلب کار آرٹسٹوں کا کارنامہ نہیں اسی سے بے نیاز عوام کی محنت کا معجزہ ہے۔ عوام کی یک جہتی یک رنگی اور خلوص و محنت کا پھل ہے اجنتا۔ ان سیدھے سچے انسانوں کا کام جنھوں نے اپنے دلوں کی ساری عقیدت، دماغوں کی ساری ذہانت، فن کی ساری دولت ہاتھوں کا سارا کمال صرف کر کے یہ غار کاٹے، یہ مورتیاں تراشیں، یہ تصویریں بنائیں۔ اور ذرا ان عظیم فن کاروں کی بے نیازی تو دیکھئے۔ کہیں کسی تصویر، کسی پتھر، کسی نقش پر کہیں کسی ایک فرد نے بھی تو اپنے نام کا کوئی نشان تک نہیں چھوڑا۔ ہاں وہ صرف اپنے فن پارے چھوڑ گئے۔ جو ان گم نام فن کاروں کی عظمت اور کمال کے گیت صدیوں سے گا رہے ہیں اور گاتے رہیں گے ع

رہیں گے نقش ان کے، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

ترک و تیاگ کے یہ رسیا نام و شہرت کو اہمیت کیوں دیتے؟ وہ یہ رازِ حیات جانتے تھے کہ انسان ذریعہ ہے اور کام مقصد۔ ان کی زندگی

ع جیئے بھی کام کی خاطر، مرے بھی کام کی خاطر

کی سچی تصویر تھی۔

اجنتا کے یہ گم نام فن کار آج بھی دنیا کو یہی پیام دے رہے ہیں کہ انسان کو ہمیشہ صبر — بے پایاں صبر — کے ساتھ دنیا کو زیادہ حسین، زیادہ دل کش، پریم و شانتی سے بھرپور بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ یہی ہر انسان — خاص کر ہر فن کار کا پہلا اور آخری مقصد ہے۔ دیکھنے والی آنکھ ان کا یہ لافانی پیام اجنتا کی ہر تصویر کے نقش میں، ہر مورتی کی آنکھ میں، ہر پھول کی رنگینی میں، ہر پھل کی شادابی میں پڑھ سکتی ہے۔ اجنتا کا ذرہ ذرہ پکار پکار کر یہ شہادت دیتا ہے کہ تہذیبیں مٹ جاتی ہیں، انسان ختم ہو جاتے ہیں۔ فن کار مر جاتا ہے مگر فن زندہ رہتا ہے۔ کام باقی رہتا ہے۔ کلا کار فانی ہے کلا باقی۔ کام مقصدِ حیات، رازِ حیات، اصلِ حیات ہے۔ کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے اور انسان ذریعہ ہے دنیا کو اپنے کام کے بل پر امن اور شانتی، پریم اور محبت کا مامن بنانے کا۔

اوج یعقوبی

غزل

وفا نہ رسوا ہو، اس تکلف میں ضبط کا زہر پی رہا ہوں
بڑے قرینے کے غم ملے ہیں، بڑے سلیقے سے جی رہا ہوں

قبولِ غم کے معاملے میں مزاج ناپختہ ہے ابھی تک
غمِ مسلسل، ذرا تامل، میں دامنِ دل کو سی رہا ہوں

ضرورتوں نے کچھ اتنا لوٹا، ضمیرِ زندہ کا ساتھ چھوٹا
اب اس قدر یاد رہ گیا ہے کہ میں کبھی آدمی رہا ہوں

گھروندے مٹی کے جیسے کوئی، بنا بنا کر بگاڑ ڈالے
فریبِ تعمیرِ زندگی میں بلاکشِ زندگی رہا ہوں

بدلتی فصلوں کی طرح بدلا کئے ہیں حالاتِ زندگانی
بڑا تعجب ہے ہر زمانے میں پھر بھی میں آدمی رہا ہوں

مری نگاہوں میں دیکھئے آپ ذہن پر بار ڈالئے کچھ
ٹٹولئے اپنے حافظے کو، میں آپ کے دل ہی میں رہا ہوں

وفا میں وہ مرحلہ بھی آیا کہ قرب نے فاصلے بڑھائے
نگاہِ یاراں میں بعض اوقات اوجؔ میں اجنبی رہا ہوں

ہنس راج رہبر

ذات اور کائنات

جھانک کر دیکھا تو گوردھن شرما گھر میں موجود تھے اور کمرے کے عین وسط میں کھڑے بیڑی سلگا رہے تھے۔

"آیئے! آیئے!!"

انھوں نے میرا سواگت کیا اور میں کھڑکی کے قریب بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ کچھ کتابیں اور پمفلٹ ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے لیکن اس طرف میرا دھیان نہیں گیا۔ میں شرما جی کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا کیونکہ میں "شاید مل جائیں" سے دل کو بہلاتا ہوا ادھر کو چلا آیا تھا ورنہ ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس وقت گھر پر موجود ہوں گے۔ موجود تھے تو اس سے مجھے حیرت کے علاوہ ایک گونہ مسرت بھی ہوئی۔ مگر دوسرے ہی لمحہ محسوس کیا کہ گھر کا ماحول افسردہ ہے اور شرما جی کسی شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا ہیں۔ جی میں آئی کہ پوچھوں آپ کی اس پریشانی کا سبب کیا ہے مگر میں ان کے منہ کی طرف دیکھ کر چپ رہ گیا۔ کچھ بھی کہتے پوچھتے نہ بن پڑا۔

ہمارا رشتہ ہی کچھ ایسا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہونے کے باوجود ایک اور دروازہ تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔ وہ اب بھی بند تھا اور اس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا ــــ "اندر آنے کی اجازت نہیں ہے!"

ان کی عمر چھپن ستاون سال تھی۔ سر کے بال پک گئے تھے اور کتابی چہرے پر بیتے دنوں کے نشان ابھر آئے تھے۔ میں انھیں ایک مدت سے جانتا تھا۔ وہ دیس کے آزمودہ سپاہی تھے۔ تحریک آزادی میں انھوں نے سرگرم حصہ لیا تھا اور جوانی کی زندگی جیل یاتراؤں میں صرف کی تھی۔ اس وقت خواہ وہ کسی بھی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں تھے مگر کسی بھی طرح کی سماجی یا سیاسی بے انصافی ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور وہ اس کے خلاف آواز بلند کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتے تھے۔ یوں بھی ان کا مطمح نظر بڑا ہی وسیع اور ترقی پسند تھا۔ خلاء میں انسانی پرواز سے انھیں جو مسرت حاصل ہوئی وہ شاید سب سے پہلے کاسموناٹ گاگرین کو بھی نہ ہوئی ہو۔ مطالعے کا انھیں بے حد شوق تھا۔ ہر نئی کتاب، رسالہ یا پمفلٹ کان میں بھنک پڑتے ہی جھٹ خرید لاتے تھے۔ قومی اور بین اقوامی مسائل پر دور تک سوچتے اور مدلل گفتگو کرتے تھے۔ مجھے نہ صرف ان کی عمر کا پاس تھا بلکہ قربانی، خلوص اور قابلیت کے لحاظ سے بھی میں ان کا بے حد احترام کرتا اور انھیں اپنا بزرگ سمجھتا تھا۔

لیکن جہاں تک ان کی ذات کا تعلق ہے انھوں نے کبھی اس فاصلے کو مدِ نظر نہیں رکھا۔ کبھی اپنی بزرگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ ہمیشہ مجھے 'متل صاحب' سے مخاطب کرتے تھے اور گزشتہ دو تین سالوں سے جب سے میں ان کے پڑوس میں آکر رہنے لگا تھا۔ مجھ میں اور ان میں گھنٹوں بات چیت رہتی تھی۔ بات چیت کا شوق بھی مجھے ان کے پاس کھینچ لے جاتا تھا اور آج بھی جب میں دن بھر لکھتے پڑھتے اور کام کرتے تھک گیا تھا۔ یہ شوق ہی مجھے ان کے مکان تک کھینچ لایا تھا۔ لیکن بات چیت کا موضوع ہمیشہ سماجی اور

سیاسی مسائل بھی ہوتے تھے۔ نہ انھوں نے میرے نجی معاملات کے بارے میں کبھی کسی دلچسپی کا اظہار کیا اور نہ مجھے ہی ان کی نجی زندگی کے بارے میں کبھی کوئی بات پوچھنے کی جرأت ہوئی۔ صرف ایک دن جب میں ان کے پڑوس میں آکر رہنے لگا تھا اتفاق سے انھیں بیس اکیس سال کی ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ آتے دیکھا تو انھوں نے اس دُبلی پتلی خوش وضع لڑکی سے تعارف کراتے ہوئے کہا تھا — "یہ ہیں میری بیٹی سنتوش۔ بی ایڈ میں پڑھتی ہیں۔"

اس واقعہ کو تین سال گزر گئے۔ سنتوش نے بی۔ ایڈ پاس کر لیا ہے اور وہ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ کبھی کبھی شرما جی کے مکان پر ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس دن کے بعد شرما جی نے لڑکی کے بارے میں یا اپنے بارے میں پھر کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں نے خود ہی سمجھ لیا ہے کہ اس لڑکی کے علاوہ اور تو کوئی آگے پیچھے ہے نہیں۔ وہ اس سُونے گھر میں اس اکیلی کو اپنے ساتھ کیا رکھیں۔ کہیں ہوسٹل وسٹل میں رہائش کا انتظام کر رکھا ہے۔ کبھی کبھی باپ سے ملنے آجاتی ہے۔

چناں چہ میرے نزدیک شرما جی خالصتاً قومی اور بین الاقوامی حیثیت کے انسان تھے — ایک ایسے انسان جن کے جگر میں سارے جہاں کا درد ہے مگر ان کا اپنا کوئی درد نہیں۔ بات چیت کو نجی معاملات کی سطح پر لانے میں ہمیشہ ان کی یہی حیثیت مانع رہتی تھی۔ ورنہ جب دو آدمی مل بیٹھتے ہیں تو وہ گھر گھرہست اور سکھ دکھ کی باتیں بھی ضرور کرتے ہیں۔ لیکن جو شخص اس طرف سے بالکل بے نیاز ہو کر زندگی کے عام چلن سے بلند اٹھ چکا ہو اسے ناحق اپنا دکھ درد سنا کر یا خود اس سے بیوی بچّوں کے بارے میں دریافت کر کے آپ اپنی نظر میں ہیچ بننا ہے چناں چہ آج بھی میں یہ نہیں پوچھ سکا کہ شرما جی آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں یا آج اس وقت گھر پر موجود رہنے کی وجہ کیا ہے؟"

انھوں نے دو تین تیلیاں ضائع کر کے بیڑی سلگائی اور کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھ گیے۔

"کہیئے، کیا حال ہے؟"

انھوں نے کش لگا کر رسماً پوچھا، جس سے میں سمجھ گیا کہ وہ دراصل کمرے میں موجود نہیں ہیں۔

"نوازش ہے۔" میں نے بھی رسماً جواب دیا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اب بیٹھوں یا جاؤں۔

"معاف کیجیئے گا۔ مجھے دھیان نہیں رہا۔ آپ سیگرٹ لیجئے۔" انھوں نے کہا اور پلنگ پر بچھی ہوئی چادر کے نیچے سے سیگرٹ کیس نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"آپ جانتے ہیں۔ میں سیگرٹ نہیں پیتا۔" میں نے معذرت کے انداز میں کہا۔

"بالکل نہیں؟"

"ہاں، بالکل ہی سمجھ لیجئے۔"

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کش کھینچنے لگے۔

"بیڑی بجھ گئی ہے۔ آپ اسے پھر جلا لیجئے۔"

"اجی کیا جلائیں گے۔" انھوں نے اپنے سفید سر کو جھٹک کر کہا۔ "میں بھی سیگرٹ پینے کا عادی نہیں ہوں۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے کبھی خیال آجاتا ہے تو یونہی جلا لیتا ہوں۔" انھوں نے صفائی پیش کی۔ اور پھر کہا۔ "دراصل میں بیڑی نہیں پیتا۔ تیلیاں پھونکتا ہوں۔"

"بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ بھی مسکرائے۔ انھوں نے ایک پاؤں کرسی کے اوپر رکھ لیا تھا اور دایاں ہاتھ جس میں بجھی ہوئی بیڑی تھی، گھٹنے کے نیچے لٹک رہا تھا۔

"یہ ملیشیا کا کیا قصّہ ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ جنوب مشرقی ایشیا میں ایک نئے جھگڑے کی بنیاد پڑ گئی۔" آخر میں نے اصل موضوع پر بات شروع کی۔

"متل صاحب، آپ نے ٹھیک فرمایا۔ یہ جھگڑے نپٹنے کی بجائے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔"

شرما جی نے سرد مہری کے لہجے میں مختصر سا جواب دیا۔ پاؤں کرسی سے نیچے اتار کر ماچس اٹھائی اور بیڑی کو دوبارہ جلانے کی کوشش کی۔ دو تین تیلیاں پھونکنے کے بعد وہ جل گئی اور شرما جی نے ایک کش

لگا کر کھڑکی کے راستے باہر گلی میں جھانکنا شروع کیا۔

وہ کھڑکی سے باہر کی طرف جھانک رہے تھے اور میں ان کے سال خوردہ چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ وہ سوچ رہے ہیں۔ ملیشیا سنگھ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ابھی تفصیل سے کریں گے اور بین اقوامی سیاست پر روشنی ڈالیں گے۔ لیکن کئی منٹ گزر گئے وہ کچھ نہیں بولے چپ بیٹھے بدستور کھڑکی سے باہر جھانکتے رہے۔

"ادھر لاؤس اور جنوبی ویت نام کی خانہ جنگی طول پکڑ رہی ہے اور اُدھر.....

میں نے انھیں اپنے وجود کا احساس دلانا چاہا لیکن انھوں نے میری بات ہی نہیں سُنی۔ وہ باہر جھانک رہے تھے اور بیڑی ان کے ہاتھ میں پھر بجھ گئی تھی۔

کچھ منٹ اور خاموش رہنے کے بعد میں نے کامراج پلان کی بات چھیڑی۔ مگر شرما جی نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ 'ہوں' 'ہاں' کرکے ٹال گئے۔ ان کے چہرے پر پریشانی اور اضطراب کے جو بادل گھر آئے تھے انھوں نے اب کالی گھٹا کی صورت اختیار کر لی تھی۔

"اندھیرا ہوگیا۔ بجلی جلا دوں۔" انھوں نے باہر سے نگاہیں سمیٹ کر کہا۔

"ہاں۔ جلا لیجئے۔" میں نے جواب دیا۔

انھوں نے اٹھ کر سوچ دبایا اور دائیں طرف ایک بلب جل گیا۔

"دیکھئے۔" شرما جی جلی ہوئی بیڑی ہاتھ میں لئے سوچ بورڈ کے پاس کھڑے کھڑے بولے۔ "یہ زیرو نمبر کا بلب ہے۔ اسے میں رات کو سوتے وقت بھی جلائے رکھتا ہوں۔ نیند کھلنے پر کمرے کی ہر ایک چیز نظر آتی ہے لیکن روشنی آنکھوں میں نہیں چبھتی۔"

پھر انھوں نے یہ بلب بجھا کر ایک دوسرا سوچ دبایا اور بائیں طرف ٹھیک میرے سر کے اوپر ایک دوسرا بلب جل گیا۔

"اس کی روشنی کچھ زیادہ ہے۔" وہ پھر بولے۔ "چلنے پھرنے اور یونہی بیٹھے رہنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن ....." انھوں نے دوسرا بلب بجھا کر ایک تیسرا جلایا اور ایک سفید اجالا سارے کمرے میں پھیل گیا۔ "جب پڑھنا ہو تب میں یہ سو نمبر کا بلب جلا لیتا ہوں اور بیٹھا پڑھتا رہتا ہوں۔ یوں میں نے تین قسم کی روشنیاں لگا رکھی ہیں۔" وہ ایک معصوم بچے کی طرح مسکرائے لیکن پھر اسی افسردہ انداز میں بولے۔ "مگر دیکھا جائے تو یہ بھی اکیلے آدمی کا من بہلاوا ہے۔ گرہست کو ان چونچلوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آپ کو بھی نہیں پڑتی ہوگی۔"

"نہیں پڑتی۔" ان کی نگاہیں اپنے چہرے پر مرکوز دیکھ کر میں نے بلا سوچے جواب دیا۔

وہ درمیانہ بلب جلا کر پھر کرسی پر آ بیٹھے اور چپ چاپ کھڑکی سے گلی میں جھانکتے رہے۔

"ہم نے کل لڑکی کی سگائی کر دی ہے۔" انھوں نے نگاہیں اندر سمیٹ کر یک بیک کہا۔

"مبارک ہو۔" میرے منہ سے نکلا اور پھر پوچھا۔ "لڑکا تو اچھا مل گیا؟"

"ہاں، ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ہے۔ وہ بھی ٹیچر ہے اور لڑکی بھی ٹیچرس ہے۔ دونوں ہم پیشہ ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو مدت سے جانتے پہچانتے ہیں۔"

"یہ تو ہونا ہی چاہیئے تھا۔ آپ بھی اگر اس بات کا دھیان نہ رکھتے تو اور کون رکھتا۔"

"ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا" انھوں نے پہلو بدل کر اور کرسی کے اوپر پاؤں رکھ کر کہا۔ "اب دل کی کچھ ایسی کیفیت ہے کہ اس میں خوشی بھی ہے اور تھکن بھی ہے جو مسافر کو منزل پر پہنچ کر محسوس ہوتی ہے۔ ہم نے پہلے اسے پڑھایا اور اب من پسند لڑکا طے کر دیا۔ ہم تو کسی رسم و رواج کو مانتے نہیں اس لیے شادی اب اس کا باپ خود کرے گا۔"

"کیا۔۔۔؟ کیا مطلب؟؟ اس کا باپ کوئی اور ہے؟" میں چونکا

"متل صاحب، آپ کو معلوم نہیں؟"

"نہیں۔"

"اچھا، کبھی بتایا نہیں ہوگا۔" انھوں نے کہا اور پاؤں نیچے اُتار کر ذرا آگے کو جھک گئے۔ "نگاہیں رہ رہ کر کھڑکی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ "میں نے تو اسے تب گود لیا تھا۔ جب یہ چار سال کی چھوٹی سی بچی تھی۔ اس کے باپ تو پنڈت جانکی داس ہیں۔ ڈاک خانے والی گلی میں ان کا بڑی مکان ہے۔ ماں باپ اور بھائی بہن ہیں۔ سنتوش ان کے ساتھ وہیں رہتی ہے۔ پہلے وہ دن میں دو تین مرتبہ ملنے آتی تھی مگر آج سارا دن گزر گیا۔ نہیں آئی۔ میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوں "

" یہ بات ہے۔" میں جھٹ بول اٹھا۔ "اب معلوم ہوا۔ ورنہ یہ سوال کئی مرتبہ میرے ذہن میں آتا کہ آپ سے پوچھوں کہ آپ شام کے وقت گھر میں کیسے موجود ہیں؟"

" ہاں، وہ آ جائے تو میں بھی باہر جاؤں۔ اگر آ کر دروازہ بند دیکھے گی تو اسے مایوسی ہوگی اور میرے دل میں بھی یہ خلش رہ جائے گی کہ پہلے ہر روز آتی تھی تو آج کیوں نہیں آئی۔" انھوں نے گلی کی طرف دیکھا اور ذرا توقف کے بعد پھر بولے۔ "شاید شرماتی ہو۔ ویسے میں نے ساری بات آج سے پہلے ۱۵۔ اگست کو طے کر دی تھی۔ آخر یہ ہماری آزادی کا دن ہے اور سچ پوچھو تو ہمارے لیے سب سے مقدس دن ہے۔ اس روز چھٹی بھی تھی۔ لڑکا اور لڑکی دونوں سامنے اس کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں بھی موجود تھا۔ دونوں سے صاف کہہ دیا کہ اپنا بھلا بُرا اب سوچ لو۔ کسی کو ایک دوسرے سے شکایت ہو تو کہہ دو۔ ورنہ آج جو بات طے ہو جائے گی اسے پتھر کی لکیر سمجھو۔ اس کے بعد تم دونوں کے گھر والوں کو رضامند کرنا میرا کام ہے۔ بسترے اگر نہیں مانیں گے تو جائیں بھاڑ میں۔ تم دونوں بالغ ہو، دونوں برسرِ روزگار ہو۔ عدالت کا دروازہ کھلا ہے۔ اپنے دو چار دوستوں کو لے کر میں تمھارے ساتھ چلوں گا اور سول میرج ہو جائے گی لیکن شکر ہے کہ دو ڈھائی مہینے کی دوڑ دھوپ کے بعد دونوں کے ماں باپ بھی مان گئے۔ رات ہم سگن بھی دے آئے۔ اب وہ جیسے چاہیں اپنے رسم و رواج کے مطابق شادی کریں۔ ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں۔ میں ضرور جاؤں گا۔ مگر اپنے کسی دوست کو مدعو نہیں کروں گا۔ آخر اس سے فائدہ ہی کیا ہے، بے کار کا جھنجھٹ ہے۔"

" میں تو سنتوش کو آج تک آپ ہی کی بیٹی سمجھتا رہا۔ اور گھر میں ساتھ نہ رہنے کی وجہ ظاہر تھی کہ آپ اکیلے ہیں۔"

" اور تو سب جانتے ہیں اس لیے میرا خیال تھا کہ آپ بھی جانتے ہوں گے۔"

" کیا آپ نے شادی ہی نہیں کی؟"

" شادی تو کی تھی۔" انھوں نے دور ماضی میں جھانکتے ہوئے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "مگر بیوی جو ملی وہ ان پڑھ ہونے کے علاوہ سمجھ بوجھ میں بھی کچھ ایسی ویسی تھی۔ ہم نے جس طرح کی زندگی بسر کی ہے، وہ آپ جانتے ہی ہیں۔ اس میں وہ بے چاری ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ والد صاحب بڑے ہی صاف گو تھے انھوں نے مجھ سے کہا۔ "بیٹا گوردھن، میں جانتا ہوں کہ تمھارے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے اس کا اب صرف یہی علاج ہے کہ تم کہو تو میں تمھاری دوبارہ شادی کر دوں۔ آپ جانتے ہیں کہ ان دنوں عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور مرد دو دو تین تین شادیاں آسانی سے کر لیتے تھے۔"

" اس میں کیا شک ہے۔" میں نے تائید کی۔

" اور یوں ہمارا گھرانا اچھا کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ میں نے والد صاحب سے کیا کہا۔ میں بولا۔" اگر آپ اس لڑکی کی دوبارہ شادی کر دیں تو کوئی ہرج نہیں۔ میں بھی کروا لوں گا۔" والد صاحب کو یہ شرط گوارا نہیں تھی اور وہ میرے مزاج کو بھی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پھر کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا، چپ ہو گئے۔ بعد میں ہمارے گھر ایک بچہ ہوا۔ وہ بھی مر گیا اور بیوی بھی مر گئی ہم نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ آخر دنیا میں جو اتنے بچے ہیں۔ وہ سب ہمارے ہی تو ہیں۔ میرا تیرا سب من کا وہم ہے۔"

" یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے زخم پر مرہم رکھا۔

" جب یہ سنتوش چار سال کی تھی تو میں نے اسے گود لے لیا۔ اب اس کی عمر بائیس سال ہے۔ بی اے بی ایڈ ہے۔ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ میرے پاس اس کی بیسیوں چٹھیاں موجود ہیں۔ باپ سے زیادہ مجھے مانتی ہے۔ ذرا بیمار پڑ جاؤں تو بہت پریشان ہوتی ہے۔ لیکن

پھر بھی لڑکی ہے بہت دوڑ دھوپ نہیں کر سکتی۔ اب بیاہ ہو جائے گا تو مجھے اور سہارا ملے گا۔ وہ لڑکے سے کہے گی۔ "پتا جی بیمار ہیں۔ دوڑ کر جاؤ اور ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔" اس وقت اگر وہ نہیں آئی تو اس کی وجہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ادھر سے اپنا ناتہ توڑ کر ادھر جوڑ رہی ہے۔ آخر وہ ناتہ آج ہی سے جڑنا شروع ہوگا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے۔ چونکہ آپ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں اس لیے میں آپ سے کہہ رہا ہوں یہ بات اس کے لیے بھی اچھی ہے اور ہمارے لیے بھی۔ اپنے کو دوسرے کا بنا کر ہی اسے اپنایا جاتا ہے۔ ہمیں بھی اس بات کی خوشی ہے۔ پہلے صرف لڑکی تھی اور اب وہ لڑکا بھی بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔ پھر ایک بات اور ہے۔" شرما جی رُکے اور ان کی آنکھیں چمکیں۔ "سیا سی آدمی پر سو طرح کے الزام آتے ہیں۔ ہمارا اور آپ کا سوچنے کا معیار الگ ہے۔ مگر عام آدمی سو طرح کی باتیں سوچتے ہیں یا ان میں بے بنیاد باتیں پھیلا دی جاتی ہیں۔ اس لیے سنتوش جب کہتی تھی۔ 'پتا جی شاپنگ کے لیے چلو، مجھے ساڑھی خریدنی ہے!' تو میں ساتھ نہیں جاتا تھا۔ اس سے کہتا تھا کہ پیسے لو اور خرید لاؤ۔ اب یہ بھی کھٹکا نہیں رہا۔ دونوں بے دھڑک آیا جایا کریں گے۔ میری خیر خیریت پوچھا کریں گے۔ اپنی خوشی سے جو جی چاہے گا خریدیں گے اور جو جی چاہے گا پہنیں گے۔ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے اور سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ دونوں کے ماں باپ بھی مان گئے۔"

" آخر ماں باپ کیوں نہ مانتے؟ اس پر انھیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟"

" متل صاحب، آپ کو معلوم نہیں۔ لڑکی برہمن کی بیٹی ہے اور لڑکا کانستھ ہے۔ یہ ذات پات کا اعتراض کیا کوئی کم مسئلہ ہے؟ ہم تم مٹھی بھر لوگ بدل گئے ہیں۔ ہمارے لیے شرما اور متل بے معنی لفظ ہیں یا یوں سمجھ لو کہ نام کا حصہ ہیں۔ لیکن اور لوگ تو نہیں بدلے۔ یہ سماج جسے بدلنے کے لیے ہم نے اتنی جدوجہد کی اور نہ جانے کتنی مصیبتیں برداشت کیں، آزادی کے سولہ سترہ سال بعد بھی ذرا نہیں بدلا۔ بدستور اپنا پھن پھیلائے ہوئے ہے۔ لوگ نہایت بے ہودہ رسم و رواج اور توہمات کے بندھن میں جکڑے ہوئے سسک رہے ہیں۔ مگر ان میں ان بندھنوں کو توڑنے کی ہمت نہیں۔ سنتوش کے باپ اور لڑکے کے والدین کو اس شادی پر رضا مند کرنے کے لیے مجھے کتنی راتوں کی نیند حرام کرنا پڑی اور کیا کیا سر دردی اٹھانا پڑی، اس کے تصور ہی سے میری روح لرز جاتی ہے۔ جب ہم پڑھے لکھوں اور مہذب کہلانے والوں کا یہ حال ہے تو ان پڑھ دیہاتیوں کی تو بات ہی جانے دیجیے۔ متل صاحب اپنی زندگی گزار کر میں تو آخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم مٹھی بھر آدمی جنھوں نے صحیح طور پر سیاسی زندگی بسر کی ہے ایک بہت بڑی تبدیلی کے خواب دیکھتے آئے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں۔ لیکن جب کوئی عملی قدم اُٹھانا پڑتا ہے اور کوئی معمولی سا بھی حقیقی مسئلہ پیش آتا ہے تو یہ خواب منتشر ہو جاتا ہے۔ اُف ــ! یہ ساری باتیں سوچ کر میرا تو جی جلتا ہے اور اس لیے شادی میں اپنے دوستوں کو مدعو نہیں کر رہا۔"

وہ اپنی بات نہایت تیکھے لہجے میں کر رہے تھے اور میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کی روح میں جھانک کر دیکھا اور شاید پہلی ہی بار محسوس کیا کہ ذات کا غم ہی کائنات کا غم ہے۔ ذات نہ ہو تو کائنات بھی کیا ہے۔

" آپ یہیں بیٹھیں گے؟" چند منٹ چپ رہنے کے بعد میں نے پوچھا۔ میرے لیے خاموشی بوجھل ہو رہی تھی۔

" ہاں! میں ابھی تھوڑی دیر اور سنتوش کی راہ دیکھوں گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ آتی ہی ہوگی۔" شرما جی نے بڑے وثوق سے کہا اور ان کی نگاہیں کھڑکی کی طرف اُٹھ گئیں۔

" اچھا، اجازت دیجیے۔ میں چلتا ہوں۔"

انھوں نے بغیر کچھ کہے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں مصافحہ کر کے چلا آیا اور راستہ بھر انھیں کے بارے میں سوچتا اور یوں محسوس کرتا رہا کہ جیسے شرما جی کے کمرے کے تینوں بلب خود اُن کے اپنے اندر باری باری جل بجھ رہے ہوں ⁂

نریش کمار شاد

شانِ نزول

اکبر الہ آبادی نوعمری میں اپنے استاد وحید الدین وحید الہ آبادی کے ساتھ دریاباد کے ایک مشاعرے میں شریک تھے۔ وہاں ایک بزرگ صورت اور کہنہ مشق شاعر نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

میں راضی قتل پہ ہوں گر وہ مجھ کو اس طرح باندھیں
کہ رسّی ہاتھ میں ان کے ہو پھندا میری گردن میں

تو اکبر داد دینے کے بعد نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے "بڑے میاں! اس کے بعد کا ایک شعر بھی تو پڑھ دیجیے۔ شاید آپ بھول گئے ہیں میں یاد دلاتا ہوں ؎

مکاں اغیار سے خالی ہو مجمع دوستوں کا ہو
کمر سے باندھ کر دامن نچادیں اپنے آنگن میں

جگر مرادآبادی کار میں بیٹھے کسی مشاعرے میں جارہے تھے کہ دفعتاً کالج کی شوخ وشنگ لڑکیوں کا ایک ہجوم سڑک پر سے گزرا اور کار رک گئی اور ریشمی آنچلوں کی مہک سے فضا چمن زار بن گئی۔ جگر صاحب نے یہ منظر دیکھ کر دھیمے سُروں میں یہ مصرع گنگنانا شروع کیا ع

خوشا کہ جلوے ہی جلوے ہیں چار سو رقصاں

ہجوم گزر گیا۔ کار چلنے لگی لیکن چند ہی قدم کے بعد کار پھر رُکی۔ سامنے سے کچھ لوگ ایک جنازہ لئے سڑک کو پار کر رہے تھے۔ جگر صاحب کے حسین ونازک ذہن کو دھچکا سا لگا اور اس کیفیت میں شعر مکمل ہوگیا ؎

خوشا کہ جلوے ہی جلوے ہیں چار سو رقصاں
فغاں کہ فرصتِ نظارگی بہت کم ہے

جوش ملیح آبادی ایک بار گرمی کے موسم میں مولینا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی غرض سے ان کی کوٹھی تک پہنچے تو وہاں ملاقاتیوں کا ایک جمِ غفیر پہلے سے موجود تھا۔ دیر تک انتظار کے بعد جب مولینا سے ملاقات کے لیے جوش صاحب کی باری نہ آئی تو انھوں نے اُکتا کر ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر مولینا کی خدمت میں بھجوا دیا ؎

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

مولینا نے یہ شعر پڑھا تو زیرِ لب مسکرائے اور فی الفور جوش صاحب کو اندر طلب کر لیا۔

آل انڈیا ریڈیو سے ایک اردو مشاعرہ نشر ہو رہا تھا۔ محروم صاحب کے پڑھنے کی باری آئی تو اناؤنسر نے اعلان کیا — "اب منشی تلوک چند مرحوم سے ان کا کلام سنیئے۔"
محروم صاحب نے اپنی غزل سے پہلے یہ فی البدیہہ شعر سنا دیا ؎

کہا محروم کو اس شوخ نے مرحوم جیتے جی
حروف اے وائے بیدردی کہ میرے نام کے بدلے

جوش ملیسانی جن دنوں ایک درس گاہ میں اردو اور فارسی کے معلم تھے، ایک روز اپنی کلاس میں پڑھانے کے لیے آئے تو زور کی آندھی شروع ہو گئی۔ جوش صاحب نے چلتے چلتے ہی ایک شعر موزوں کر لیا اور جماعت کے کمرے میں پہنچ کر اپنی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اسے بلیک بورڈ پر لکھ دیا ؎

اور ہوتے ہیں جو محفل میں خموش آتے ہیں
آندھیاں آتی ہیں جب حضرت جوش آتے ہیں

راج نرائن ارمان دہلوی جو داغ کے شاگرد تھے اور بول چال میں گھمنڈ کی بجائے گھمنڈا کہنا جن کا تکیہ کلام تھا اپنی شاعرانہ فضیلت ظاہر کرنے کے لیے ایک بار کہہ رہے تھے کہ ارے ان کل کے شاعروں کو کیا گھمنڈا ہے۔ ہم داغ کے شاگرد ہیں داغ کے ہمارے مقابلے میں کوئی کیا شعر کہہ سکتا ہے۔

پنڈت ہری چند اختر نے یہ الفاظ سُنے تو اسی وقت یہ شعر موزوں کر دیا ؎

تو داغ کا شاگرد ہے یا داغ کا استاد
داغی ہیں مگر سب ترے اشعار گھمنڈا

ٹونک کے ایک مشاعرے میں طرح مصرع تھا ؏

اللہ تری شان کے قربان جایئے

وہاں کے ایک بزرگ شاعر مولوی عبدالسلام خیال سے ان کے چند عقیدت مندوں نے کہا کہ اس مصرع پر گرہ لگانا تو ناممکن ہے، داغ نے یہ مطلع کہہ کر کچھ اور کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ ؎

وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں مری مان جایئے
اللہ تیری شان کے قربان جایئے

خیال صاحب نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی اور کچھ دیر تک کھوئے رہنے کے بعد ایکا ایکی چونک کر بولے کہ گرہ لگانی محال ضرور ہے لیکن ناممکن تو نہیں۔ دیکھئے کوشش تو میں نے بھی کی ہے اور یہ کہہ کر یہ شعر سنا دیا ؎

یوسف کو قید اور زلیخا کے ملک میں
اللہ تیری شان کے قربان جایئے

اختر شیرانی کے ایک بے تکلف دوست ان سے ایک خوبصورت امیر زادی کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ ایک شام اسی دوست کے ساتھ مے کدے میں بیٹھے بیٹھے اختر صاحب کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ ساغر و مینا سے منہ موڑ کر اس لڑکی کو دیکھنے کے لیے بضد ہو گئے۔ آخر اختر صاحب کا وہ دوست اسی عالم میں جب انھیں اس حسینہ کی کوٹھی کے دروازے تک لے کر آیا تو اتفاق سے ایک عورت باہر آ رہی تھی۔ اختر صاحب کے دوست نے بتایا کہ یہ ان کی والدہ ہیں۔ اختر صاحب چند لمحوں تک سراپا اشتیاق بن کر اس ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھتے رہے اور پھر بے اختیار ان کی زبان سے نکلا کہ ماں کے حسن کا یہ عالم ہے تو بیٹی کو آنکھ بھر کر دیکھنا بھی ممکن نہ ہوگا اور پھر اسی عالم میں یہ شعر کہہ دیا ؎

گلِ فسردہ بھی اک طرفہ حسن رکھتا ہے
خزاں یہ ہے تو مجھے خواہش بہار نہیں

حیدر دہلوی ایک مخصوص ادبی نشست میں اپنی غزل سُنا رہے تھے جس کے اس شعر پر غیر معمولی داد دی گئی ؎

تمھاری گرمیٔ محفل کے رنگ نے اڑ کر
کہیں پناہ نہ پائی تو آفتاب بنا

سامعین میں دو صوفی حضرات شریک تھے۔ غزل سننے کے بعد ایک نے دوسرے کی ٹوپی کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا "حضرت شیخ کی پگڑی تو بہت اچھالی جا چکی ہے۔ ٹوپی کی طرف غالباً کوئی شاعر متوجہ نہیں ہوا۔"

حیدر صاحب نے یہ سُن کر ذرا تامل کیا اور اسی وقت اس غزل میں اس شعر کا اضافہ کر دیا ؎

کلاہِ حضرتِ واعظ نہ پھینک اے واعظ
بنا سکے تو اسے ساغرِ شراب بنا

انوار حسین آرزو لکھنوی ابھی چودہ برس کے تھے جب ان کے محلے کے ایک بزرگ نے ازراہِ مذاق ان سے کہا کہ میاں منجھو! سنا ہے تم بھی شعر کہنے لگے ہو۔ اگر اس مصرع کا دوسرا مصرع ایک سال میں بھی کہہ دو تو تمھیں شاعر مان لوں۔ مصرع یہ ہے ؏

اڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

آرزو صاحب نے مؤدب ہو کر جواب دیا "قبلہ! زندگی کا کیا بھروسہ سال کی قید کیوں۔ لیجئے آپ کی فرمائش میں ابھی پوری کئے دیتا ہوں اور کچھ تامل کے بعد آرزو صاحب کہنے لگے کہ لیجئے حضرت! مطلع ہو گیا ہے ؎

دامن اس یوسف کا آیا پرزے ہو کر ہاتھ میں
اڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

گوپی ناتھ صاحب امن ایک دفعہ نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کو درخت لگانے کے لیے دہلی کے بدھ جینتی پارک میں لے گئے۔ وہاں سرکاری اور غیر سرکاری حضرات کا بڑا مجمع تھا جس کے اصرار پر ذاکر صاحب کو تقریر کرنی پڑی۔ اپنی تقریر میں انھوں نے فرمایا کہ درختوں میں ایک خوبی ہے کہ فائدہ پہنچاتے ہیں مگر زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ اتنی سی بات سن کر امن صاحب نے اپنی نئی غزل کے لیے زمین تلاش کر لی اور مطلع میں ذاکر صاحب کی اسی بات کو منظوم کر دیا ؎

انساں سے ہیں بلند شجر بولتے نہیں
دیتے ہیں سایہ اور ثمر بولتے نہیں

۱۹۴۷ء کے بعد جب اتر پردیش میں فسادات کے ایک دوسرے دور کا آغاز ہو چکا تھا، رام پور میں ایک مشاعرہ ہوا۔ رام پور کے اردگرد کی فضا مکدر تھی۔ حضرت عرش ملسیانی بھی اس مشاعرے میں مدعو تھے اور وہاں کی سہمی ہوئی مخلوق کا تصور ان کے ذہن پر محیط تھا۔ چنانچہ مشاعرے میں اپنا کلام سنانے سے پہلے عرش صاحب نے پوری غزل اسی پس منظر کے پیشِ نظر کہہ دی جس کا یہ شعر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے ؎

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

ڈپٹی کلکٹر خان صاحب عزیز الحسن مجذوب جو فی الواقع فنا فی الشعر تھے ایک دفعہ حسبِ عادت متوسط رفتار سے اپنی کار خود ہی چلا رہے تھے کہ اچانک پیچھے سے آنے والی ایک کار کے ہارن کی آواز کانوں میں گونجی اور مسلسل چند منٹوں تک گونجتی رہی۔ اور پھر وہی کار ان کے دائیں طرف سے آگے بڑھنے لگی۔ اس کار کو ایک خوش جمال خاتون ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس نے دقیانوسی وضع قطع کے مجذوب صاحب کو واقعی کوئی پیشہ ور ڈرائیور سمجھ کر حقارت سے کہا۔ "بہرا!" اور اپنی کار کو تیزی سے آگے لے گئی۔ مجذوب صاحب اس خاتون سے آنکھیں چار ہوتے ہی کھو سے گئے اور اس عالمِ وارفتگی میں ان کی زبان سے نکلا ؎

اس ناز سے اس شان سے اس تیز روی سے
گزرو گے تو دنیا ہی سے جائیں گے گزر ہم

شاعروں کی ایک مخصوص محفل میں میرزا یاس یگانہ چنگیزی کا ذکر ہو رہا تھا۔ کسی نے اس تمہید کے ساتھ میرزا کا ایک شعر سنایا کہ یہ شعر یگانہ کی خود سری اور پوری جذباتی زندگی کا آئینہ دار ہے ؎

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاس کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجئے

شعر سن کر سبھی شاعر سر دھننے لگے۔ لیکن سوہن لال ساحر کچھ فکرمند سے ہو گئے اور تھوڑی دیر کی خاموشی کے ساتھ بولے ؎

ناحق پرستیوں کا بھی لازم ہے احترام
بدنام ہو چکی ہیں بہت حق پرستیاں

وزیراعظم شری جواہرلال نہرو تیسرے پنج سالہ پلان پر دستخط کر رہے ہیں